

بھارت کے
فرعون



گوالیار کے ٹارچر سیل

اسکیمینڈ

50
REPRINTED 1999



اوپر ایک چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والا آدمی کھڑا تھا۔

ڈیوڑھی کی روشنی میں وہ مجھے صاف نظر آرہا تھا۔ شکل سے وہ جموں کا مسلمان لگتا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ زینے کی چھ سات سیڑھیاں تھیں۔ اس نے پوچھا۔

”کشمیری مجاہد ہو؟“

میں حیران رہ گیا۔ اس نے خدا جانے کیسے اندازہ لگا لیا تھا۔ پھر بھی میں نے جھوٹ بولا اور کہا۔

”میں کشمیری مجاہد نہیں ہوں۔ مگر پولیس کو مجھ پر شک ہے کہ میں کشمیری مجاہد ہوں۔ وہ میرے پیچھے آرہی ہے۔“

اس آدمی نے کہا۔

”جلدی سے اوپر آجاؤ“

میں اوپر سیڑھیاں چڑھ کر گیا تو وہ دروازے سے ہٹ گیا اور بولا۔

”سامنے والی کوٹھڑی میں چھپ جاؤ“

سامنے ایک کوٹھڑی تھی۔ اس میں گھس کر پلنگ کر نیچے چھپ گیا۔ پولیس اس دوران مکان کے باہر پہنچ گئی تھی۔ چونکہ گلی آگے بند تھی اور یہ مکان گلی کا آخری مکان تھا اس لئے پولیس کو یقین تھا کہ میں اسی مکان میں گیا ہوں۔ دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ مجھے اس آدمی کی آواز آئی۔

یقین آگیا کہ میں اسی مکان کی چھت کو دروازہ کھٹکھٹانے کی بجائے مکان میں گھس گئی۔ سامنے والے مکان سے لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ پولیس گلی سے واپس چلی گئی تھی۔ ملک صاحب اوپر آگئے۔ اس دوران میں کوٹھڑی میں چلا گیا تھا۔

دروازہ کھول کر وہ بھی کوٹھڑی میں آگئے۔ آتے ہی بولے۔

”تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم میرے مکان میں گھس آئے تھے۔ اگر کنیا لعل کے مکان میں چلے جاتے تو اس وقت پولیس تمہیں ہتھکڑی لگا کر اپنے ساتھ تھانے لے جا رہی ہوتی۔“

میں نے اس شخص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کا احسان مند ہوں“

ملک صاحب بولے۔

”پولیس نے میری بات کا اس لئے یقین کر لیا تھا کہ اگرچہ میں مسلمان ہوں مگر میں جموں کی کانگریس کمیٹی کا رکن ہوں۔ سب مجھے کانگریسی مسلمان سمجھتے ہیں مگر اندر سے میں بکا مسلمان کشمیری ہوں اور میری ساری ہمدردیاں کشمیری مجاہدین کے ساتھ ہیں۔ تم مجھے اپنے بارے میں چاہے نہ بتاؤ لیکن میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ پولیس کی زبانی میرے اندازے کی تصدیق ہو چکی ہے کہ تم کشمیری مجاہد نہیں بلکہ پاکستانی کمانڈو ہو۔ پاکستان پر میری جان نثار۔ خدا کا شکر ہے تم پولیس کے درندوں کے ہاتھ لگنے سے بچ گئے۔ اب بتاؤ تم کہاں جانا چاہتے ہو اور اس محلے میں کیسے آگئے تھے؟“

میں نے ملک صاحب کو اپنے کمانڈو مشن کے بارے میں تو کچھ نہ بتایا صرف اتنا کہا۔

”میں پاکستانی ضرور ہوں اور کمانڈو بھی ہوں لیکن پاکستان کی طرف سے یہاں نہیں بھیجا گیا۔ میں پاکستانی مسلمان ہونے کے ناطے از خود جماد کشمیر میں شریک ہونے کے لئے بارڈر کراس کر کے کشمیر پہنچا ہوں۔“

ملک صاحب مجھے بڑی عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے آدمی کی شکل

”کون ہے بھی۔ کیا بات ہے؟“

مجھے خیال آیا کہ یہ آدمی کہیں پولیس کا مخبر ہی نہ ہو۔ کہیں پولیس کو بتانہ دے کہ میں اوپر چھپا ہوا ہوں۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں پلنگ کے نیچے سے نکلا اور دبے پاؤں چلتا سیڑھیوں والے دروازے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا۔ پولیس کانسٹیبل کی آواز آئی۔

”ملک صاحب آپ کو تکلیف دی ہے۔ بات یہ ہے کہنگ ایک پاکستانی کمانڈو کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ اسی گلی میں گھسا تھا“

جس آدمی کا وہ گھر تھا اور جس نے مجھے کوٹھڑی میں چھپ جانے کو کہا تھا اس کو پولیس کانسٹیبل نے ملک صاحب کہہ کر بلایا تھا اور لگتا تھا کہ پولیس اس آدمی کو جانتی تھی۔ میں کان لگائے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ ملک صاحب نے کہا۔

”پاکستانی کمانڈو میرے گھر میں آتا تو بھلا بیچ کر کہاں جا سکتا تھا میں تو خود اسے دبوچ لیتا۔“

اب ایک اور پولیس والے کی آواز سنائی دی۔

”مکروہ گیا کہاں۔ اسی طرف آیا تھا“

ملک صاحب نے کہا۔

”میرا خیال ہے سامنے کنیا لعل کے مکان کی چھت پر سے دوسری طرف بھاگ گیا ہو گا چلو میں خود تمہارے ساتھ چل کر اسے ڈھونڈتا ہوں۔“

پولیس کانسٹیبل نے کہا۔

”نہیں نہیں ملک جی آپ کہاں تکلیف کریں گے سبک خود اسے پکڑ لیں گے آخر جائے گا کہاں۔ دوسری گلی میں بھی پولیس موجود ہے۔ ہم کنیا لعل کے مکان پر دیکھتے ہیں۔“

معلوم ہوتا تھا کہ سامنے والے کنیا لعل کے مکان کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ پولیس کو

دیکھ کر اس کے دل کا تھوڑا بہت حال معلوم کرنے کا تجربہ ہو چکا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ ملک صاحب کے دل میں تحریک آزادی کشمیر اور پاکستان کے واسطے گہری ہمدردی کا جذبہ موجود ہے۔

وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

”میں ابھی آتا ہوں“

وہ باہر چلے گئے۔ باہر دالان تھا جہاں سے ایک زینہ اوپر چھت پر جاتا تھا۔ وہ زینہ چڑھتے نظر آئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آکر بولے۔

”پولیس ساتھ والی گلی میں مکانوں کی تلاشی لے رہی ہے۔ میں اوپر چھت پر سے دیکھ آیا ہوں۔ تمہیں ابھی یہاں سے نہیں نکلنا چاہئے۔ تم فکر نہ کرو۔ پولیس دوبارہ میرے مکان پر نہیں آئے گی۔ خوش قسمتی سے آج میرا ہندو ملازم بھی گھر پر نہیں ہے۔ پولیس نے اسے میرے گھر کی نگرانی کے لئے خاص ذریعے سے میرے گھر میں نوکر کروا دیا ہوا ہے۔ میں ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ مگر محتاط رہتا ہوں۔ اتفاق سے آج وہ اپنی ماما سے ملنے کھنوعہ چلا گیا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو معاملہ بالکل الٹ ہو سکتا تھا۔“

ملک صاحب نے مجھے ایک رات اور ایک دن اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔ میں ملک صاحب کا نام نہیں بتاؤں گا۔ ان کی ذات ملک بھی میں نے اپنے طور پر لکھ دی ہے۔ پولیس نے انہیں کسی دوسری ذات کے نام سے پکارا تھا۔ کیونکہ یہ جہاد کشمیر کا خفیہ کارکن مجاہد آج بھی جموں میں موجود ہے اور کشمیری مجاہدین کی مدد کر رہا ہے۔ اس کے باوجود میں نے ملک صاحب کو اپنے مشن، جموں کے حریت پرست غلام رسول اور دلی کے ماسٹر سپائی گل خان کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ اخبار میں خبر آگئی تھی کہ نھرا نیرو گیشن سنٹر سے ایک خطرناک پاکستانی جاسوس فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ ملک صاحب نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ کیا وہ خطرناک پاکستانی جاسوس میں ہی ہوں؟ میں نے انہیں کہا تھا۔

”میرا کسی پاکستانی جاسوس سے کوئی تعلق نہیں اور یہاں کشمیر میں کسی پاکستانی کو

جاسوس بن کر یا کمانڈو بن کر آنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ کشمیر کا بچہ کمانڈو بن کر اپنے وطن کو بھارتی قبضے سے آزاد کرانے کے لئے خون کے نذرانے دے رہا ہے۔ کشمیر کے حریت پرست مجاہد خود اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ میں بھی کشمیری مسلمانوں کے شانہ بشانہ دشمن کے خلاف جنگ کرنے آیا ہوں۔ جاسوسی وغیرہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

ملک صاحب بے اختیار پکار اٹھے۔

”جزاک اللہ جزاک اللہ! اب ہماری منزل زیادہ دور نہیں ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب ہم وادی سے غاصب بھارتی فوج کو بھاگنے پر مجبور کر دیں گے اور کشمیر پر آزادی کا پرچم لہرائے گا۔“

انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جانا چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں سری نگر جانا چاہتا ہوں۔

”میں مجاہدین آزادی کا ایک ضروری پیغام لے کر دلی سے سری نگر ہی جا رہا تھا کہ کسی نے میری مخبری کر دی اور لاری اڈے پر اترتے ہی پولیس نے مجھے گھیر لیا۔ اگر میں ذرا سستی کرتا تو پکڑ لیا جاتا۔ مگر میں موقع پاتے ہی دوڑ پڑا پولیس بھی میرے پیچھے دوڑی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح سری نگر واپس پہنچ جاؤں۔“

میرا ارادہ بھی وہاں سے سری نگر کشمیری حریت پرست کمانڈو شیروان کے پاس جانے کا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جموں کے مجاہد غلام رسول نے زخمی گل خان کو کسی نہ کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہو گا۔ میرا واپس دلی جانا خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ میرے لئے سری نگر جا کر کمانڈو شیروان سے مل جانا ہی بہتر تھا تا کہ کسی اگلی کمانڈو مشن کی تیاری کی جائے اور بھارت کی فرعونیت اور ظلم و استبداد پر ایک اور کاری ضرب لگائی جائے۔ جموں کے نھرا نیرو گیشن سنٹر کے عقوبت خانے سے اپنے آدمی گل خان کو فرار کروانے کا ہمارا مشن کامیاب ہو چکا تھا۔ اب کسی دوسرے کمانڈو مشن کی پلاننگ کی ضرورت تھی۔ ملک

جاتی ہے۔ پولیس کے پاس تمہاری اخبار میں چھپی ہوئی تصویر موجود ہے۔“
میں نے کہا۔

”خواہ کچھ بھی ہو۔ میرا کشمیر کے محاذ پر پہنچنا ضروری ہے۔ میرے ساتھی وہاں جنگ کر رہے ہیں۔ میں یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتا۔“
ملک صاحب بولے۔

”فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے یہاں سے نکلنے کا میں نے بندوبست کر دیا ہے۔ آج آدھی رات کے بعد ایک آدمی یہاں آئے گا۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ وہ اپنا ہی آدمی ہے۔ وہ تمہیں بانمال تک پہنچا دے گا۔“
”بس میں بانمال پہنچ جاؤں۔ آگے سارا راستہ میرا جانا پہچانا ہے۔ آگے میں خود چلا جاؤں گا۔“

میں نے ملک صاحب سے جب پوچھا کہ جو آدمی مجھے لینے آدھی رات کو آرہا ہے وہ کس طریقے سے مجھے جموں سے نکالے گا تو وہ کہنے لگے۔

”یہ بات اس نے مجھے بھی نہیں بتائی۔ تم اس کے ساتھ چلے جانا۔ وہ پہلے بھی خطرناک حالت میں یہاں سے کشمیری کمانڈوز کو نکال کر لے جاتا رہا ہے۔ لیکن اس نے اپنے ذریعے کے بارے میں مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ حالات ایسے ہیں کہ سب کو کبھی کبھی ایک دوسرے سے بھی رازداری سے کام لینا پڑتا ہے۔“

رات کو کھانا کھانے کے بعد ملک صاحب نے سلاوار میں سبز کشمیری چائے بنائی۔ گم چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے اس طرح رات کے ساڑھے گیارہ بج گئے۔ ملک صاحب نے دو تین بار اٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ کہنے لگے۔

”میرا خیال ہے وہ تھوڑی دیر میں آنے ہی والا ہے۔“

سوا بارہ بجے تو نیچے ڈیوڑھی کے دروازے پر کسی نے تین مرتبہ آہستہ آہستہ دستک دی۔ رات کی خاموشی میں یہ آواز بڑی صاف سنائی دی تھی۔ ملک صاحب جلدی سے اٹھے۔

صاحب کہنے لگے۔

”ابھی تمہارا یہاں سے سری نگر روانہ ہونا مناسب نہیں ہو گا۔ پولیس تمہاری شکل صورت سے واقف ہے۔ پولیس نے جموں سری نگر روڈ پر جگہ جگہ تاکہ بندی کر رکھی ہو گی۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم دو ایک دن یہیں چھپے رہو۔“
میں نے کہا۔

”اس دوران آپ کا ہندو نوکر آگیا تو مشکل پیش آسکتی ہے“
ملک صاحب نے کہا۔

”اس کی طرف سے تم بے فکر ہو جاؤ وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گیا ہے۔“
میں نے ملک صاحب سے کہا۔

”ہمارے کشمیری مجاہد وادی کشمیر میں بھارتی ظلم و استبداد کے خلاف برسرِ پیکار ہیں وہ سبے بہا قربانیاں دے کر خون کے نذرانے پیش کر کے آزادی کشمیر کی شمع کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں میں یہاں آرام سے کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔ آپ صرف اتنا انتظام کر دیں کہ میں جموں سے کسی طرح نکل جاؤں۔ آگے بانمال کی پہاڑیوں میں پہنچ کر میں خود راستہ تلاش کر لوں گا۔“

تب ملک صاحب کو بھی جماد کشمیر کی نازک صورت حال کا احساس ہوا۔ کہنے لگا۔
”خدا تمہیں جماد کشمیر میں کامیابی عطا فرمائے میں کل رات تمہارے یہاں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی انتظام کر دوں گا۔ تم آج کی رات اور کل کا دن میرے مکان میں ہی چھپے رہنا۔ یہاں سے باہر مت نکلتا۔“

وہ رات اور دوسرا دن بھی میں نے ملک صاحب کے مکان میں چھپ کر گزار دیا۔ دوسری رات کو ملک صاحب جہاں گئے ہوئے تھے وہاں سے واپس آکر کہنے لگے۔

”جموں بانمال روڈ پر پولیس نے جگہ جگہ تاکہ بندی کر رکھی ہے۔ پولیس کو یقین ہے کہ تم ابھی تک جموں میں ہی ہو۔ دوسری طرف جموں کھٹوعہ روڈ پر بھی پولیس تمہاری تلاش میں ناکوں پر موجود ہے۔ جموں سے جالندھر ہو شیار پور جانے والی لاریوں کی تلاشی لی

”اپنا آدمی آگیا ہے۔“

وہ نیچے چلے گئے۔ مجھے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ ملک صاحب اس آدمی کو لے کر اوپر آگئے۔ یہ ایک پتلا دبلا آدمی تھا۔ اس نے گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ آنکھیں شہباز کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ آتے ہی مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

میں نے اپنا نام بتایا۔ اس نے دوسرا سوال کیا۔

”سری نگر میں کس کے پاس جاؤ گے؟“

میں نے کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان کا نام لینا مناسب نہ سمجھا۔ میں بھی انتہائی رازدارانی سے کام لے رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”سری نگر میں اپنے ساتھی مجاہدین کے پاس جاؤں گا۔“

سری نگر کے شمال مشرق کی پہاڑیوں میں جہاں کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان کا خفیہ ہائیڈ آؤٹ تھا اس کا ایک خاص کوڑا نام تھا جو صرف کمانڈو شیروان اور اس کے تین مجاہد ساتھیوں کو ہی معلوم تھا۔ شیروان نے یہ کوڑا نام مجھے بھی بتا دیا ہوا تھا۔ جب ہمیں کسی جگہ خفیہ کمین گاہ کے بارے میں معلوم کرنا ہوتا تھا تو ہم اپنی جانب سے کوڑا نام کا آدھا لفظ بولتے تھے۔ اگر دوسرا آدمی باقی کا آدھا لفظ ٹھیک بتا دیتا تھا تو ہم سمجھ جاتے تھے کہ یہ اپنی کمانڈو فورس کا آدمی ہے۔ میں حیران رہ گیا جب اس آدمی نے کمانڈو شیروان کی خفیہ کمین گاہ کا آدھا کوڑا لفظ بول کر کہا۔

”کیا تم اسے مکمل کر سکتے ہو؟“

اب اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ یہ اپنا ہی آدمی ہے۔ میں نے فوراً کوڑا کا باقی لفظ اسے بتا دیا۔ یہ سن کر وہ آدمی مسکرایا اور ملک صاحب سے کہنے لگا۔

”ہمیں قدم قدم پر بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ جہاں سری نگر پولیس اور ملٹری

انٹیلی جنس نے اپنے خنجر چھوڑ رکھے ہیں۔ ہمیں ان سے بھی خبردار رہنا پڑتا ہے۔“

پھر اس نے مجھ سے کہا۔

”میرے ساتھ آجاؤ۔ میں تمہیں تمہاری منزل تک پہنچا دوں گا۔“

میں نے ملک صاحب سے ہاتھ ملایا اور ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ وہ آدمی بولا۔

”ان فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں والے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں بھی جلدی سے اس کے پیچھے ہو گیا۔ ملک صاحب کے مکان سے نکلے۔ گلی کے باہر بازار بھی خالی اور تاریک تھا۔ وہ آدمی میرے ساتھ چل رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”میں تمہیں اپنا اصلی نام نہیں بتاؤں گا تم مجھے شاہ جی کہہ کر بلا سکتے ہو“

جہاں شہر کے اس سنان بازار میں تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ ہمیں دیکھ کر ایک کتا بھونکتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ گلی اونچی نیچی اور تنگ تھی۔ یہ گلی آگے ایک تنگ بازار میں نکلتی تھی۔ شاہ جی اب آگے آگے چل رہے تھے۔ گلی ختم ہوئی تو اس نے مجھے ہاتھ سے پیچھے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود بازار میں دائیں بائیں دیکھا۔ تیزی سے میرے پاس آئے اور مجھے کھینچتے ہوئے ایک مکان کے پاس جہاں اندھیرا تھا لے گئے اور سرگوشی میں کہا۔

”پولیس کی گشتی پارٹی آرہی ہے۔“

جہاں کھڑے تھے وہاں اندھیرا تھا۔ بازار میں قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر میں نے تین چار پولیس کے سپاہیوں کو ایک دوسرے سے باتیں کرتے گلی کے آگے سے گزرتے دیکھا۔ ایک سپاہی اچانک گلی کے سامنے آکر رک گیا۔ شاہ جی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے پیچھے کر دیا۔ دوسرے سپاہی نے ڈوگری زبان میں اس سے پوچھا۔ کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے گلی میں؟ پہلے والا سپاہی کہنے لگا۔ یہاں بہت اندھیرا ہے۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ پاکستانی کمانڈو یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔ دوسرے سپاہی نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

”گویند رام! آجاؤ۔ پاکستانی کمانڈو اب تک کشمیر پہنچ چکا ہو گا۔“

اور وہ ڈوگرہ سپاہی جس کا نام گویند رام تھا آگے بڑھ گیا۔ جب ان پولیس والوں کی آوازیں دور ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئیں تو شاہ جی مجھے لے کر بازار میں آگئے اور

تمہارے ساتھ جاؤں گا اب اندر جا کر لیٹ جاؤں راتوں رات جموں کے علاقے سے نکل جانا چاہتے ہیں۔“

میں ٹرک پر چڑھ کر لکڑی کی شہتیر یوں کے نیچے جو خالی جگہ بنائی گئی تھی وہاں لیٹ گیا۔ شاہ جی کہنے لگے۔

”جموں بانمال روڈ پر پولیس کی چیک پوسٹیں ہیں۔ پولیس چیکنگ کرے گی۔ تم کوئی آواز مت نکالنا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔“

میرے اوپر اور دائیں بائیں لکڑی کے شہتیر اور چھوٹی سیلیاں اس طرح لگا دی گئیں کہ میں اس میں پوری طرح چھپ گیا۔ مجھے باہر کی روشنی بھی نظر آتا بند ہو گئی مگر جگہ اس طرح بنائی گئی تھی کہ میں پہلو بدل سکتا تھا اور ٹانگیں بھی سمیٹ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ٹرک کا انجن شارٹ ہو گیا۔

دوسرے لمحے ٹرک سڑک پر چل رہا تھا۔

میں لکڑی کے شہتیر یوں کے اندر اندھیرے میں ایسے پڑا تھا جیسے مردہ قبر میں پڑا ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مردہ بے حس و حرکت ہوتا ہے اور میں پہلو بدل سکتا تھا۔ ہاتھ پیر ہلا سکتا تھا۔ ٹرک نے سڑک پر آنے کے بعد ایک خاص رفتار پکڑ لی تھی اور اسی رفتار پر چلا جا رہا تھا۔ اگر میں سخت جان نہ ہوتا اور اپنی کمانڈو تربیت کے دوران مجھے اس قسم کی اذیتیں برداشت کرنے کی ٹریننگ نہ ملی ہوتی تو شاید میں تھوڑی دیر بعد ہی گھبرا جاتا۔ مگر میں آنکھیں بند کئے خاموشی سے لیٹا رہا۔ ٹرک چلتا رہا۔ کبھی سڑک کی چڑھائی آجاتی اور کبھی ٹرک نشیب میں اترنے لگتا۔ وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اندھیرا اور اندھیرا ہی تھا۔ وقت جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ کافی دیر گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ میدانی علاقہ آگیا ہے۔ ٹرک ہموار سڑک پر چل رہا تھا۔ اس دوران سامنے کی طرف سے آنے والے ٹرک بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد گزرتے رہے۔ مجھے تازہ ہوا برابر آرہی تھی۔ میں نے سو جانے کا ارادہ کیا مگر اس خیال سے جاگتا رہا کہ راستے میں پولیس کی ٹاکہ بندی ہے۔ پولیس اور فوج بھی موجود ہوگی۔ چیکنگ کے دوران کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

کہنے لگے۔

”خطرہ بہت قریب آکر ٹل گیا۔ اب ہمیں یہاں سے تیز تیز چل کر نکل جانا ہو گا“ شاہ جی مجھے اپنے ساتھ جموں کی تنگ و تاریک گلیوں اور سنان بازاروں میں سے گزار کر آخر شہر کے شمال کی جانب ایک میدان میں آگئے۔ یہاں نشیب میں مجھے ایک جگہ بجلی کا بلب جلتا نظر آیا۔ اترائی اتر کر وہاں آگئے۔ یہ لاریوں اور ٹرکوں کا اڈہ لگتا تھا۔ ایک طرف دو لاریاں کھڑی تھیں۔ کچھ خالی ٹرک بھی کھڑے تھے۔ ایک ٹرک میں لکڑی کے شہتیر لدے ہوئے تھے۔ شاہ جی کو دیکھ کر ایک آدمی کوٹھڑی سے نکل کر آگیا۔

شاہ جی نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

”سب ٹھیک ہے؟“

وہ آدمی بولا۔

”ٹھیک ہے شاہ جی“

اس آدمی نے شاہ جی نہیں کہا تھا۔ یہ میں نے راز داری برتنے کے لئے اپنی طرف سے لکھ دیا ہے۔ شاہ جی ٹرک کی پیچلی طرف آگئے۔ یہ بہت بڑا ٹرک تھا۔ لکڑی۔ کبھی شہتیر سیدھے بھی کھڑے تھے اور ایک دوسرے کے اوپر بھی لدے ہوئے تھے۔ ایک اور آدمی کوٹھڑی سے نکل کر آگیا۔ انہوں نے ایک طرف سے تین شہتیر ہٹا دیئے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ٹرک کے اندر ایک کھلی جگہ بنی ہوئی تھی۔ بانس کے ساتھ جلتے بلب کی روشنی میں یہ جگہ صاف نظر آرہی تھی۔ شاہ جی نے مجھ سے کہا۔

”تمہیں جموں سے بانمال تک یہاں لیٹ کر سفر کرنا ہو گا۔ کیا تم یہ تکلیف برداشت

کر سکتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”یہ کوئی تکلیف نہیں ہے۔“

شاہ جی بولے۔

”سفر لمبا ہے۔ لیکن راستے میں دیکھ بھال کرتے رہیں گے میں بانمال تک

میں تم سے اپنی محبت کی توہین کا ایسا انتقام لوں گی کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔ کبھی دلی میں نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کے پاس جو مغل شہزادے کی قبر تھی اس کی طرف دھیان چلا جاتا۔ مغل شہزادے کی روح نے بھی مجھے خبردار کیا تھا کہ بہت جلد مجھ پر ایک ناگمانی آفت نازل ہونے والی ہے۔ مجھے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ مغل شہزادے کی روح نے ساتھ ہی مجھے اس ناگمانی آفت سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا تھا جو آپ کو پہلے بتا چکا ہوں اور آپ نے پڑھ بھی لیا ہو گا لیکن آپ کی یادداشت کو تازہ کرتے ہوئے میں ایک بار پھر بیان کئے دیتا ہوں۔ مغل شہزادے کی روح نے کہا تھا۔

”سہوستان کے شہر نجیب آباد کے باہر پتھر گڑھ کا پرانا قلعہ ہے۔ یہ قلعہ نواب نجیب الدولہ نے اپنے دور اقتدار میں بنوایا تھا۔ نواب نجیب الدولہ حق و باطل اور کفر و اسلام کی جنگ کے وہ بہادر مجاہد تھے جنہوں نے سہوستان کے اسلام دشمن ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا اور اسلام کے پرچم کو سر بلند رکھا۔ پتھر گڑھ کا قلعہ اسی مجاہد کی یادگار ہے۔ اس قلعے کے عقب میں نجیب آباد کے جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک بڑا ہی دشوار گزار اور خطرناک جنگل ہے۔ اس جنگل کا نام کجلی بن ہے۔ کجلی بن کے اندر ایک ٹیلہ ہے۔ اس ٹیلے کو لال پہاڑی بھی کہتے ہیں۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس ٹیلے کی چوٹی پر دو سرخ رنگ کی مخروطی چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی ہیں۔ جب تم پر ناگمانی آفت نازل ہو تو تم کجلی بن کے جنگل کی لال پہاڑی پر جانا۔ وہاں پہاڑی کے دامن میں ایک پرانا کنواں ہے۔ اس کنوئیں کے پاس بانس کے جھنڈ میں ایک قبر بنی ہوئی ہے۔ اس قبر کا اب ایک نشان ہی باقی رہ گیا ہے۔ قبر کے پتھر زمین سے ابھرے ہوئے ہیں۔ تم وہاں با وضو ہو کر فاتحہ پڑھنا۔ یہ اس مسلمان مجاہد کی قبر ہے جو کفر و اسلام کی جنگ میں مرہٹہ سپاہیوں کے ایک دستے سے لڑتی ہوئی شہید ہو گئی تھی۔“

مغل شہزادے کی روح نے کہا تھا کہ فاتحہ پڑھنے کے بعد وہاں آدمی رات تک بیٹھے رہنا۔ اگر خدا نے چاہا تو آدمی رات کے وقت شہید خاتون کی روح آکر تجھ سے ہم کلام ہوگی اور تجھے بتائے گی کہ تم پر جو آفت نازل ہوئی ہے اس کا علاج کیا ہے۔

میرا خیال ہے ٹرک کو جہوں کے اڈے سے چلے کوئی ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ ٹرک کی رفتار ایک دم سے ہلکی ہونا شروع ہو گئی۔ میں چوکس ہو گیا۔ ایسے لگا جیسے ٹرک سڑک سے اتر گیا ہے۔ پھر ٹرک رک گیا۔ مجھے شاہ جی کی آواز آئی۔ وہ کسی کو کہہ رہے تھے۔

”رام رام مہاراج!“

کسی نے کہا۔

”ٹرک کی چیکنگ ہو گئی۔ تم اس طرف آ کر کھڑے ہو جاؤ۔“

میرا دل دھڑکنے لگا۔ یہ پولیس یا فوج کے آدمی تھے۔ انہوں نے شاہ جی کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے ٹرک پر لدے ہوئے شہتیروں کو ادھر ادھر ہٹا کر دیکھا جا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ ان کے لہجے سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ فوج کے نہیں بلکہ ڈوگرہ پولیس کے آدمی ہیں۔ یہ لوگ آگے شہتیروں کو ٹارچ کی روشنی میں دیکھتے میری طرف آگئے۔ اندھیرے میں شہتیروں کی درزوں میں سے ٹارچ کی روشنی کرنوں کی شکل میں مجھ پر پڑتی اور غائب ہو جاتی۔ میں سانس روکے شہتیروں کے نیچے بالکل سیدھا پڑا رہا۔ شہتیر بڑے بڑے تھے۔ پولیس والے انہیں ہٹا تو نہیں رہے تھے مگر ان کے اندر ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھ رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ زبردست خطرہ میرے اوپر منڈلا رہا تھا۔ پھر ٹارچ کی روشنی درزوں میں سے آنا بند ہو گئی۔ شاہ جی کی آواز آئی۔

”مہاراج! آج کل اتنی زیادہ چیکنگ کیوں ہو رہی ہے؟“

کسی نے جواب میں کہا۔

”تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

میری جان میں جان آئی۔ میں نے گہری سانس لی اور اپنے اکڑے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا دوسرے لمحے ٹرک آگے روانہ ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ نیند بالکل نہیں آرہی تھی۔ دماغ میں الٹ پلٹ خیال آنے لگے۔ کبھی راجستھان کی بدروح چندریکا کا خیال آتا جو میری دشمن بن کر میرے پیچھے لگی ہوئی تھی اور جس نے مجھے کہہ دیا تھا کہ

ٹرک بانمال روڈ پر اپنی خاص رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ پھر مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں سو گیا۔ آنکھ ایک دھچکے کے ساتھ کھل گئی۔ ٹرک رک رہا تھا۔ مجھے لکڑی کی شتريوں کی چھوٹی چھوٹی درزوں میں سے دن کی روشنی نظر آئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں کسی صندوق میں بند ہوں۔ ٹانگوں کو دائیں بائیں سیٹھ کر اوپر نیچے کرنے لگا۔ دن چڑھ گیا تھا۔ ٹرک رک گیا۔ اس کے ساتھ ہی شہتیر ادھر ادھر ہٹائے جانے لگے۔ شاہ جی کی آواز آئی۔

”جاگتے ہو کہ سو رہے ہو؟“

میں نے کہا۔

”جاگ رہا ہوں شاہ جی“

شاہ جی کے ساتھ ڈرائیور اور ٹرک کا کلینر دونوں مل کر شہتیر ادھر ادھر ہٹا رہے تھے۔ پھر میں باہر نکل آیا دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ٹرک ایک جگہ پہاڑیوں کے درمیان ویران جنگل میں کھڑا تھا۔ شاہ جی کہنے لگے۔

”آؤ ناشتہ کرلو۔ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ راتے میں پولیس نے زیادہ چیکنگ نہیں کی۔ پہلے چیک پوائنٹ پر ڈوگرہ فوجی کھڑے تھے۔ انہوں نے ٹارچ کی روشنی ڈال کر چیکنگ کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ تمہیں نہیں دیکھ سکے اس کے بعد پولیس والے زیادہ تر میرے واقف تھے۔ ہم لوگ ہفتے میں دو بار مال لے کر جموں سے بانمال جاتے رہتے ہیں۔“

ٹیلے کے دامن میں ایک چھوٹا سا پہاڑی چشمہ بہہ رہا تھا۔ میں نے وہاں منہ ہاتھ دھویا پانی پیا۔ شاہ جی اپنے ساتھ مکئی کی گڑ والی میٹھی روٹیاں، مکھن اور تھرمس میں چائے لائے تھے۔ ہم نے چشمے کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ چائے پی۔ میں نے شاہ جی سے پوچھا۔

”ابھی بانمال کتنی دور ہے؟“

وہ بولے۔

”شام کو پہنچیں گے۔ ٹرک کی رفتار بھی زیادہ نہیں کر سکتے۔“

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں دوبارہ شہتیروں کے اندر بنی ہوئی قبر میں جا کر لیٹ گیا۔ میرے اوپر شہتیر ڈال دیئے گئے۔ اور ٹرک بانمال کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوپہر کے بعد ٹرک کسی جنگل میں ایک بار پھر روک دیا گیا۔ وہاں بھی میں نے شہتیروں کے نیچے سے نکل کر شاہ جی کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑی میٹھی روٹی کھائی۔ چائے پی اور آگے روانہ ہو گئے۔ جب سورج غروب ہو گیا اور رات کی تاریکی جموں کشمیر کی پہاڑیوں پر اترنے لگی تو ٹرک اپنی منزل پر پہنچ کر رک گیا۔ مجھے شہتیروں کے اندر سے نکالا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ٹرک ایک کچی سڑک کے کنارے کھڑا ہے۔ اس کی بتیاں بجھی ہوئی ہیں۔ اوپر کوئی سڑک تھی جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بتیاں جل رہی تھیں شاہ جی نے اوپر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ہم بانمال سے دو میل آگے نکل آئے ہیں۔ اوپر جو تم روشنیاں دیکھ رہے ہو یہ بانمال سری نگر روڈ کی روشنیاں ہیں۔ یہاں سے تمہیں اکیلے ہی سری نگر تک سفر کرنا ہو گا۔ ہم لوگ یہاں سے ٹرک لے کر واپس بانمال جائیں گے اور مال اتار کر کل صبح واپس جموں روانہ ہو جائیں گے۔“

میں اوپر دیکھ رہا تھا۔ پہاڑی کے پہلو میں ایک سڑک تھی جس کی بتیاں جھللا رہی تھیں۔ شاہ جی نے مجھ سے پوچھا۔

”تم سری نگر تک کس طرح جاؤ گے؟ سڑک پر تمہیں لاری بھی مل جائے گی۔ تم جنگلوں میں سے گزر کر جاؤ گے یا لاری میں بیٹھ کر جاؤ گے؟“

میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے میں خطرے سے کافی دور ہو گیا ہوں۔ اب سری نگر جانے والی کسی لاری میں بیٹھ جاؤں گا“

”جیسے تمہاری مرضی“

شاہ جی نے کہا۔

”پہلے تم اوپر جاؤ۔ تمہارے جانے کے بعد ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“

سے ہو کر پہاڑیوں کے جنگل میں داخل ہو گیا۔ کئی گھانٹیاں اور کھائیاں عبور کرنے کے بعد آخر میں اس مقام پر آگیا جہاں سے کمانڈو شیروان کی خفیہ کمپن گاہ کی حد شروع ہوتی تھی۔ اب میں محتاط ہو کر چل رہا تھا۔

یہاں چنار کے گھنے جھنڈ تھے۔ کوئی سڑک یا پگ ڈنڈی نہیں تھی۔ میں درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ ایک جگہ اچانک دو کشمیری مجاہد درختوں میں سے نکل کر میرے سامنے آگئے۔ انہوں نے شاٹ گنیں تھام رکھی تھیں۔ ان کا رخ میری طرف تھا۔ ان کے چہرے بزم صافوں میں چھپے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ میں رک گیا۔ ایک کشمیری مجاہد نے اردو میں پوچھا۔

”کون ہو؟“

میں نے کمانڈو شیروان کی کمپن گاہ کا خاص کوڈ لفظ بولا انہوں نے شاٹ گنیں نیچی کر لیں۔ ایک مجاہد نے ایک اور کوڈ لفظ بول کر پوچھا۔

”اس کا دوسرا لفظ کیا ہے؟“

مجھے معلوم تھا۔ میں نے دوسرا لفظ بول کر کوڈ مکمل کر دیا۔ اب انہیں یقین ہو گیا کہ میں کمانڈو شیروان کا خاص آدمی ہوں۔ کیونکہ شیروان کی کمپن گاہ کا کوڈ سوائے اس کے چند ایک قریبی مجاہدوں کے کسی دوسرے کو معلوم نہیں تھا۔ تب دوسرا کشمیری مجاہد کہنے لگا۔

”آگے دوسرے گارڈ بھی ڈیوٹی پر ہیں۔ ہم تمہیں آج کا پاس ورڈ بتا دیتے ہیں۔“

اس نے مجھے اس روز کا پاس ورڈ بتا دیا۔ وہاں پر روز پاس ورڈ بدل دیا جاتا تھا۔ میں ایک گھانٹہ کی چڑھائی چڑھ کر اس پہاڑی کے قریب پہنچا جس کے غار میں کمانڈو شیروان کی خفیہ ہائیڈ آؤٹ تھی تو تین کشمیری مجاہد اچانک سامنے آگئے۔ میں نے پاس ورڈ بتایا تو انہوں نے مجھے راستہ دے دیا لیکن دو قدموں کا فاصلہ ڈال کر شاٹ گنیں اٹھائے میرے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ یہ جگہ میری دیکھی بھالی تھی۔ نیلے کا چھوٹا سا موڑ گھوم کر میں پہاڑی کے دامن میں اس جگہ آگیا جو کمانڈو شیروان کی اصل کمپن گاہ تھی۔ یہاں چاق

میں نے شاہ جی سے ہاتھ ملایا۔ ڈرائیور اور کلینر سے بھی ہاتھ ملایا۔ انہیں خدا حافظ کہا اور جھانڈیوں میں سے اوپر سڑک کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ سڑک پر آکر میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں سے شام کے بعد شروع رات میں سری نگر جانے والی لاریاں مل جاتی ہیں میرے پاس پیسے موجود تھے۔ اتنے میں نیچے شاہ جی کے ٹرک کے شارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر یہ آواز آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔ ٹرک کچی سڑک پر سے ہوتا ہوا آگے جا کر بانمال روڈ پر نکل گیا تھا۔ میں سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے کے پاس پتھر پر بیٹھا بانمال سے آنے والی کسی لاری کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد دور سے مجھے لاری کی بتیاں نظر آئیں۔ لاری پہاڑی کے گرد چکر لگا کر آرہی تھی۔ جب روشنیاں قریب آئیں تو میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ کا اشارہ دیا۔ لاری میرے قریب آکر رک گئی۔ یہ لاری سری نگر جا رہی تھی۔ اس میں کافی مسافر بیٹھے تھے۔ میں بھی اس میں سوار ہو گیا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد میں نے مسافروں کا جائزہ لیا۔ مجھے اس میں کوئی مشکوک شکل دکھائی نہ دی۔ لاری چل پڑی۔

دوسرے دن سری نگر پہنچتے ہی میں لاری اڈے سے نکل کر ایک طرف چل پڑا۔ میرا لباس عام پڑھے لکھے لوگوں ایسا تھا۔ جیکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ گلے میں گلوینڈ بھی تھا۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھانا شروع ہو گئے تھے۔ میں چلتے چلتے شہر سے کافی باہر نکل آیا تھا۔ یہاں سے میں شمال مشرق کی جانب کھیتوں میں ہو گیا۔ سڑک پر میں نے بھارتی فوجیوں کے ٹرک دیکھے جو شہر کی طرف جا رہے تھے۔ بازاروں میں اور چوک میں ڈوگرہ اور سکھ فوجی بھی نظر آئے۔ کھیتوں میں دور تک چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے کس طرف جانا ہے۔ کھیت ختم ہو گئے۔ آگے میدان آگیا۔ یہ ایک کھلا میدان تھا جس میں کشمیری کسانوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ کشمیری عورتیں چولہوں میں آگ کے پاس بیٹھی تھیں۔ میں خاموشی سے ان کے قریب سے گزر گیا۔ دور سامنے پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ پہاڑیوں کی ڈھلانون پر چڑھ اور چنار کے درخت اوپر تک چلے گئے تھے۔ مجھے ان پہاڑیوں میں جانا تھا جہاں کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان کی خفیہ کمپن گاہ تھی۔ میں اوپر

وچوبند چار مجاہد کمانڈو کی وردیوں میں شات گئیں اٹھائے کھیں گاہ کے غار کے منہ پر دونوں جانب کھڑے تھے۔ ان میں کمانڈو بٹ بھی تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ دور سے مجھے سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دے کر کمانڈو شیروان کا پوچھا تو اس نے کہا۔
”اندر میٹنگ ہو رہی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں کمانڈر کو خبر کرتا ہوں۔“

میں رک گیا۔ کمانڈو بٹ غار کے اندر چلا گیا۔ میرے قریب ہی جو تین کشمیری گارڈ کھڑے تھے ان کے ساکت چہرے بتا رہے تھے کہ کوئی ایمر جنسی پیدا ہو گئی ہے اور حالات نارمل نہیں ہیں۔

میں کھیں گاہ کے باہر خاموش کھڑا تھا۔

ماحول کی کشیدگی کا احساس مجھے سری نگر شہر میں بھارتی فوجی ٹرکوں کو تیزی سے ادھر ادھر جاتے اور بازاروں میں ڈوگرہ فوجیوں کی ناکہ بندیوں سے ہی ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ اتنے میں کمانڈو بٹ نے آکر کہا۔
”کمانڈر تمہارا انتظار کورہا ہے“

میں غار کے اندر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہائیڈ آؤٹ میں گیس کے لیمپ کی روشنی میں کمانڈو شیروان اپنے چار مجاہد ساتھیوں کے ساتھ میز کے گرد کھڑا ایک نقشے کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سرسری طور پر میرے سلیوٹ کا جواب دیا۔ اس کا چہرہ اس کے فکر مند خیالات کا آئینہ دار تھا۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ میز پر پھیلے ہوئے نقشے کو دیکھ رہے تھے اس پر جگہ جگہ پہاڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک پہاڑی پر لال پنسل سے گول دائرے کا نشان بنا تھا۔ کمانڈو شیروان نے اس جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”ہمارا ٹارگٹ یہ پہاڑی ہے۔“

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔

”بھارتی فوجیوں نے رات سری نگر کے مضافاتی علاقے شاہ میراں میں گھس کر مسلمانوں کے سارے مکانوں کو نذر آتش کر دیا ہے۔ ان مکانوں میں رہنے والوں میں سے کوئی مسلمان عورت بوڑھا جوان اور بچہ زندہ نہیں بچا۔ سب کے سب جل کر شہید ہو گئے ہیں۔“

جب زمین کے اندر پھٹتا ہے تو اس کے دھماکے کی طاقت چار گنا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ محض ایک گولہ بارود کا ڈپو ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک طرح سے ایٹم بم بن جاتا ہے۔
میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

”اس کا مطلب ہے ہمیں پہاڑی تک بڑی لمبی سرنگ کھودنی پڑے گی۔ یہ کافی لمبی سرنگ ہوگی اور چونکہ یہ انڈین ملٹری ایمونیشن ڈمپ کی سرنگ کے نیچے سرنگ ہوگی اس پر کافی وقت لگ جائے گا۔ اور ہمارے مجاہدوں اور کمانڈوز کو دوسرے محاذوں پر بھی لڑنا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہو گا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس اتنی لمبی سرنگ کھودنے کے وسائل بھی نہیں ہیں۔ ہم اپنے بے حد محدود وسائل کے اندر آزادی کشمیر کی جنگ لڑ رہے ہیں یہ حقائق آپ کے پیش نظر ضرور ہوں گے۔“
کمانڈو شیروان بڑے غور سے میری بات سنتا رہا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کر لی تو وہ بڑے پرسکون لہجے میں کہنے لگا۔

”تم نے بالکل درست نتیجہ نکالا ہے۔ یہ ساری باتیں مجھے معلوم تھیں۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمیں اتنی لمبی سرنگ نہیں کھودنی پڑے گی۔ بلکہ ہم کوئی نئی سرنگ نہیں کھودیں گے“

”تو پھر ہم بھارتی ایمونیشن ڈمپ تک کیسے پہنچیں گے؟“

کمانڈو شیروان کی وضاحت میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔ میرے خیال میں آپریشن پلان مزید الجھ گیا تھا۔ کمانڈو شیروان نے نقشے پر سرخ نشان والی پہاڑی کے بائیں جانب انگلی رکھ کر کہا۔

”یہ جگہ دیکھ رہے ہو؟“

میں نقشے پر جھک گیا۔

”دیکھ رہا ہوں“

کمانڈو شیروان اور میرے علاوہ وہاں پر موجود باقی چاروں کمانڈو بھی خاموش تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں شیروان کی سکیم معلوم تھی۔ کمانڈو شیروان نے کہا۔

کرنے کے لئے بڑی موزوں تھی۔ چنانچہ بھارتی فوج کی ان پہاڑی والی دونوں رجمنٹوں نے سرنگ میں اپنا ایمونیشن اسلحہ اور فوجی ساز و سامان ذخیرہ کر دیا ہوا ہے۔“
میں نے پوچھا۔

”کیا ہمیں اس ایمونیشن ڈپو کو اڑانا ہو گا؟“

”تم نے بالکل ٹھیک کہا۔“

کمانڈو شیروان نے کہا۔

”لیکن اس سرنگ میں ایمونیشن کے ذخیرے تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ پہاڑی کے ارد گرد بھارتی فوج کا پورا بریگیڈ دن رات پہرے پر موجود ہوتا ہے۔ رات کو ساری رات بجلی کے بڑے بڑے بلب پہاڑی کے ارد گرد روشن رہتے ہیں۔ اگر کوئی چیونٹی بھی وہاں سے گزرے تو نظر آجاتی ہے۔ فوج نے پہاڑی کے ارد گرد کی ساری جھاڑیاں صاف کر کے ایک ہموار پٹی بنا دی ہے۔ پہاڑی کے اندر ایمونیشن کے ذخیرے تک جو سرنگ جاتی ہے اس کے منہ کو لوہے کے مضبوط دروازے سے بند کر دیا گیا ہے باہر مسلح گارڈ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی بدل بدل کر موجود رہتے ہیں۔ یہ ساری اطلاعات ہمارے مخبروں نے ہمیں پوری تفصیل سے بتا دی ہیں۔“

میں نے کہا۔

”تو پھر ہمارا پلان کیا ہو گا؟ ہم زمین کے اندر سے حملہ کیسے کریں گے“

کمانڈو شیروان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے دباتے ہوئے بولا۔

”ہم بھارتی اسلحہ ایمونیشن والی سرنگ کے نیچے ایک سرنگ کھودیں گے۔“

میں سمجھ گیا کہ کمانڈو شیروان کا پلان کیا تھا۔ وہ ایمونیشن والی پہاڑی سرنگ کے نیچے سرنگ کھود کر گولہ بارود کے ذخیرے میں آگ لگانا چاہتا تھا۔ گولہ بارود کے ذخیرے میں آگ لگنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک ہیبت ناک دھماکے سے گولہ بارود کا ذخیرہ پھٹتا اور اس کے ساتھ ہی پہاڑی اور پہاڑی پر موجود انڈین رجمنٹوں کے سارے فوجی بارکوں اور فوجی ٹرکوں سمیت بھک سے اڑ جاتے اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا۔ ایمونیشن ڈمپ

مشن کے لئے اشد ضرورت تھی۔ کیا تم اس مشن پر جانے کے لئے تیار ہو؟“
میں نے کہا۔

”میں بھارتی غاصب فوجیوں کے خلاف ہر مشن پر جانے کے لئے ہر وقت تیار ہوں
کمانڈر؟“

کمانڈو شیروان نے جزاک اللہ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں نے شیروان سے
پوچھا۔

”کیا ہمارے کمانڈوز کو وہ راستہ معلوم ہے جو پہاڑی کے عقب میں مغلیہ دور کی
پرانی سرنگ کے دہانے تک جاتا ہے؟“

کمانڈو شیروان نے ایک کمانڈو کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

”یہ ہمارا مجاہد کمانڈو گڈریئے کے بھیس میں اس علاقے کا سارا نقشہ بنا کر لے آیا
ہے۔ بلکہ یہ پرانی سرنگ کے اندر جا کر اس جگہ کی نشان دہی بھی کر آیا ہے جس کے اوپر
ہمارے اندازے کے مطابق گولہ بارود کا ذخیرہ ہے۔“

اس کشمیری کمانڈو نے مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا۔

”میرا نام اورنگ زیب ہے۔ میں سری نگر یونیورسٹی میں سول انجینئرنگ کا سٹوڈنٹ
رہ چکا ہوں۔ میں اس مہم میں آپ کے ساتھ ہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا ٹارگٹ غلط
ثابت نہیں ہو گا۔“

دوسرے روز سارا دن ہم اپنے خفیہ ہائیڈ آؤٹ میں اپنے کمانڈو آپریشن کی تیاریوں
میں لگے رہے۔ میرے سمیت اس مشن کے لئے کل چار کمانڈوز چنے گئے تھے۔ ایک میں
دوسرا کمانڈو اورنگ زیب اور دو کمانڈو ہمارے تجربہ کار مجاہد تھے جو آزادی کشمیر کی جنگ
میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے۔ اب ہم رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ہمیں
رات کے ٹھیک سوا بارہ بجے اپنے کمانڈو مشن پر روانہ ہونا تھا۔

”اس پہاڑی کی پچھلی جانب ٹھیک اس جگہ چھوٹی سی ایک اور سرنگ بھی ہے جس کا
بھارتی فوجیوں کو ابھی تک علم نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں بھارتی فوج کا پہرہ
نہیں ہوتا۔ رات کو صرف گشتی پارٹی پٹرول کرتی ہے۔ یہ سرنگ قدرتی نہیں ہے اسے
مغل بادشاہوں کے زمانے میں پہاڑی کھود کر بنایا گیا تھا اور معلوم نہیں انہوں نے کس
لئے یہ سرنگ بنائی تھی۔ یہ چھوٹی سرنگ آگے جا کر بند ہو جاتی ہے اور ٹھیک اس جگہ جا
کر بند ہوتی ہے جہاں اس کے اوپر بھارتی فوج کا گولہ بارود کا ذخیرہ موجود ہے۔ ہم نے
اپنے خاص آدمی کے ذریعے اس کا پورا سروے کر لیا ہے۔ گویا یہ چھوٹی سرنگ پہاڑی والی
قدرتی سرنگ کے نیچے سے ہو کر گولہ بارود کے ذخیرے تک جاتی ہے۔ ہمیں اس چھوٹی
سرنگ میں داخل ہو کر جہاں سرنگ بند ہو جاتی ہے وہاں سے چھت میں سوراخ کر کے
اوپر والی سرنگ میں پہنچ کر ایمونیشن ڈمپ میں ٹائم بم لگانا ہو گا۔ بس یہی ہمارا ٹارگٹ ہے
اور یہی ہمارا کمانڈو آپریشن ہو گا“
میں نے سوال کیا۔

”کیا اس بات کا ہمارے پاس ٹیکنیکل ثبوت موجود ہے کہ چھوٹی مغلیہ دور کی سرنگ
جہاں ختم ہوتی ہے اس کی چھت کے عین اوپر ہی بھارتی فوج کا اسلحہ اور گولہ بارود کا ذخیرہ
ہے؟“

کمانڈو شیروان نے کہا۔

”ہم موقع پر جا کر سروے نہیں کر سکتے یہ سارے اندازے ہم نے اور ہمارے انجینئر
مجاہدوں نے نقشے بنا کر اور چھوٹی سرنگ کے بارے میں ملی ہوئی اطلاعات کو سامنے رکھ کر
لگائے ہیں ان میں تھوڑا بہت فرق ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے جہاں چھوٹی سرنگ ختم ہوتی ہے
اس کی چھت کے عین اوپر ایمونیشن ڈمپ نہ ہو بلکہ تھوڑا آگے یا پیچھے ہو ایسی صورت
میں ہمیں چھت میں بڑا سوراخ ڈال کر اوپر والی سرنگ میں خود جا کر ٹائم بم پلانٹ کرنا ہو
گا۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ ہمارے چار کمانڈو کل رات اس مشن پر جا رہے ہیں اچھا
ہوا کہ تم آگئے۔ تم بڑے ٹھیک وقت پر آئے ہو۔ ہمیں تم ایسے تجربہ کار کمانڈو کی اس

منزل کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے تھے۔ کسی کسی وقت ہم آپس میں کوئی بات کر لیتے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب اس مہم میں ہمارا گائیڈ تھا۔ اسے سارے رستے کا علم تھا۔ وہ ہمیں شارٹ کٹ پہاڑی راستوں سے لے جا رہا تھا۔ کافی دیر چلتے رہنے کے بعد ہم ایک کھلی جگہ پر آکر رک گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ پہاڑی کچھ فاصلے پر تھی۔ اس کے اوپر خوب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”یہی وہ پہاڑی ہے جس پر انڈین انفنٹری ڈویژن کی دو بمبٹوں کی چھاؤنی ہے۔ یہی ہمارا ٹارگٹ ہے۔ ہم دوسری طرف سے ہو کر پہاڑی کے عقب میں پہنچیں گے۔ اس میدان کے آگے جا کر حساس ایریا شروع ہو جائے گا۔ گو۔“

اور ہم کھلے میدان میں چل پڑے۔ میدان میں بھی ہلکی ہلکی دھند تھی۔ مگر یہ دھند زمین سے کوئی دو گز تک ہی اونچی تھی۔ ہم خود رو جنگلی جھاڑیوں میں سے گزر رہے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب کچھ دور چلنے کے بعد بائیں جانب ہو گیا۔ میدان آگے جا کر ختم ہو گیا اور اونچے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ چنار کے درخت تھے۔ ہم ان درختوں کے نیچے سے بھی گزر گئے۔ درختوں کے جھنڈوں کے آگے بھارتی چھاؤنی والی پہاڑی کے ازگرد کا صاف علاقہ شروع ہوتا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے ہمیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ ہم سب قریب قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ رات خاموش اور تاریک تھی۔ ہمارے چہرے سیاہ نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ہمیں اندھیرے میں صرف ایک دوسرے کی چمکتی ہوئی آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ پہاڑی کے اوپر فوجی چھاؤنی کی روشنیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ چھاؤنی پر بھی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے آہستہ سے کہا۔

”آگے دشمن کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں سے ہمیں درمیان میں چھ چھ قدم کا فاصلہ ڈال کر ایڈوانس کرنا ہو گا۔ مگر ہمیں ایک دوسرے کو دیکھتے رہنا ہو گا۔ جس نے جتنا کھانسا ہے اب کھانس لے۔ کیونکہ اس کے آگے کھانسا صرف ہماری ہی نہیں بلکہ

ہماری چار کمانڈوز کی پارٹی تھی۔

دوپہر تک ہم ضروری تیاریوں میں مصروف رہے۔ دوپہر کے بعد ہم نے شام تک آرام کیا۔ رات کو نماز عشاء کے بعد ہائیڈ آؤٹ کے غار کے اندر پلاننگ روم میں ایک اور میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں نقشے کی مدد سے ہمیں پورے علاقے اور خاص طور پر بھارتی فوج کے گیرزن والی پہاڑی کی تمام تفصیلات سمجھائی گئیں۔ چار انتائی دھماکہ خیز ٹائم بم ہمارے پاس موجود تھے۔ یہ ٹائم بم بارود کے چار چھوٹے سلنڈروں کی شکل کے تھے جنہیں آپس میں سٹیل کے تاروں سے باندھا گیا تھا۔ ہر بم کے ساتھ ایک ٹائم ڈیوائس لگا تھا جس کا ایک بٹن بھی تھا۔ ٹائم بم ایمونیشن ڈمپ میں لگانے کے بعد اس بٹن کو ایک ہی وقت میں دبانا تھا تاکہ چاروں بم ایک ہی وقت میں پھٹیں۔ ان بموں کا وقت صرف پچیس منٹ تھا۔ ان پچیس منٹوں کے اندر بم لگانے کے بعد ہمیں سرنگ سے نکل کر دوسری پہاڑیوں میں اپنی محفوظ جگہ پہنچنا تھا۔ رات کے ٹھیک سوا بارہ بجے ہماری کمانڈو پارٹی اپنے مشن پر روانہ ہو گئی۔ ہم میں سے ہر کمانڈو کے پاس چار چار ہینڈ گرنیڈ، ایک ایک ایمونیشن جیکٹ، شین گنیں اور چار چار بھری ہوئی فالٹو میگزینیں تھیں۔ رات کے اندھیرے میں ہم اپنے چہروں پر سیاہ نقاب چڑھائے شین گنیں ہاتھوں میں لئے فل کمانڈو وردیوں میں اپنے خفیہ ہائیڈ آؤٹ سے نکل کر اپنے ٹارگٹ کی طرف چل پڑے۔ رات تاریک تھی۔ ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب آگے آگے ہماری را نمائی کر رہا تھا۔ ہم پہاڑی پگ ڈنڈیوں اور کھنڈوں اور خشک نالوں میں سے گزرتے اپنے

ہمارے مشن کی موت کا باعث ہو سکتا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے صرف اشاروں میں بات کریں گے۔ کمانڈو اشارے آپ سب کو معلوم ہیں۔ کیا آپ لوگ سمجھ گئے ہیں؟“
ہم نے آہستہ سے کہا۔

”سمجھ گئے ہیں“

”کوئی سوال؟“

ہم نے یک زبان ہو کر کہا۔

”کوئی سوال نہیں“

”آل رائٹ۔ گو“

کمانڈو اورنگ زیب اٹھ کر سب سے پہلے آگے چلا۔ اس کے پیچھے چھ قدم کا فاصلہ ڈال کر میں چل پڑا اور اسی طرح چھ قدموں کا فاصلہ ڈال کر میرے دوسرے دو کمانڈو ساتھی بھی پیچھے پیچھے آنے لگے۔ ہم جھک کر چل رہے تھے۔ زمین کے اوپر گز ڈیڑھ گز تک پھیلی ہوئی سرد دھند کی وجہ سے ہمیں دور سے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے ہیولے دھند میں حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ جس زمین پر ہم چلے جا رہے تھے وہ اگرچہ غیر ہموار تھی مگر بھارتی فوج نے تمام جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس اور سرکنڈوں کو کاٹ دیا ہوا تھا۔ جھک کر چلتے چلتے ہم پہاڑی کے دامن میں اس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں اوپر کسی پوسٹ سے سرچ لائٹ کی روشنی نیچے پڑ رہی تھی۔ یہ روشنی گول دائرے کی شکل میں تھی اور پہاڑی کے دامن میں آہستہ آہستہ ایک جانب سے زمین پر پڑتی اور پھر ایک جگہ رک کر واپس چلی جاتی۔

میں نے کمانڈو اورنگ زیب کو ایک جگہ رکتے دیکھا۔ کمرے اور دھند میں سے مجھے اس کا سایہ سا نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک خاص اشارہ کیا۔ اس اشارے کا مطلب تھا کہ میرے پاس آنے سے پہلے پیچھے آنے والی کمانڈو پارٹی کو بھی خاص اشارہ کرو۔ میں نے اپنے پیچھے اپنے ساتھیوں کو خاص اشارہ کیا اور خود دوڑ کر کمانڈو اورنگ زیب کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ دو سیکنڈ بعد ہمارے دوسرے دو ساتھی بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گئے۔ کمانڈو

اورنگ زیب کی نظریں پہاڑی چھاؤنی کے فوجی گیریزن سے آنے والی گھومتی روشنی کے گولے پر جمی ہوئی تھیں۔ سرچ لائٹ کی روشنی کا گول دائرہ کافی بڑا تھا۔ پھر ایک جگہ رک گیا اور وہاں سے اسی طرح واپس ہونے لگا۔ ہمارا اور پہاڑی کا فاصلہ اب زیادہ نہیں تھا۔ ہمیں پہاڑی کے اوپر وہ کھبے بھی نظر آنے لگے تھے جن پر بجلی کے بڑے بڑے بلب روشن تھے۔ ان کی روشنی پہاڑی کے نیچے تک آرہی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے سرگوشیوں میں کہا۔

”ہمیں سرچ لائٹ کی روشنی کو کراس کرنا ہے۔ جہاں روشنی کا دائرہ جا کر رک جاتا ہے ٹھیک اس جگہ پر وہ سرنگ ہے جس میں ہمیں داخل ہونا ہے۔“
اس نے سرگوشی میں حکم دیا۔

”اپنی اپنی شین گتیں اور ایمونیشن چیک کرو“

ہم اندھیرے اور دھند میں چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے اپنی اپنی شین گتوں کو اوپر اٹھا کر چیک کیا۔ پھر اپنے اپنے میگزین بیلٹوں کو خاص انداز سے چیک کیا۔ اورنگ زیب نے دوسرا حکم مجھے دیا۔
”چیک یوئیر ٹائم بم“

میں نے اپنی کمر کے ساتھ بندھے ہوئے تھیلے میں سے چاروں ٹائم بم نکال کر چیک کئے اور کہا۔
”اوکے“

کمانڈو اورنگ زیب نے سرگوشی میں کہا۔

”انڈین فوج کی پٹرول کمپنی گشت پر ہوگی۔ اس سے ہر حالت میں اپنے آپ کو دور رکھنا اور چھپانا ہے۔ فائر ہرگز نہیں کرنا۔ کمانڈو چاقو سے دشمن کی شہ رگ کاٹنی ہے۔ اوکے؟“

ہم سب نے آہستہ سے کہا۔

”اوکے“

پھاڑی کی دیوار کے ساتھ ساتھ کھبے لگے تھے ان پر بھی بجلی کے بلب جل رہے تھے جن کی روشنی کافی تھی اور پھاڑی کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں اور لوہے کی خاردار تار دکھائی دے رہے تھے۔ تین بھارتی فوجی جو رات کی گشت پر تھے باتیں کرتے پھاڑی کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں سیگنوں کے ساتھ کندھوں پر لٹکا رکھی تھیں۔ وہ آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں کرتے ہم سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر سے گزر گئے۔ وہ سرچ لائٹ کے روشن دائرے میں سے گزرے تو ان کی رائفلوں کی ٹالیاں اور سٹیل کے ہیلٹ چمک اٹھیں۔

جب وہ پھاڑی کے پہلو میں کچھ دور جا کر اندھیرے اور کمرے میں غائب ہو گئے تو پارٹی کے کمانڈر اورنگ زیب نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ہم دوبارہ کچھوڑوں کی طرح کنیوں کے سہارے ریگنے لگے۔ کمانڈو اورنگ زیب ریگتے ریگتے کچھ اور بائیں جانب ہو گیا تھا۔ ہم کمرے اور اندھیرے کی چادر میں چھپ گئے تھے۔ ہم بڑی مشکل سے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ ہم بیس گز کا فاصلہ طے کر کے پھاڑی کے دامن میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں خاردار تار لگا ہوا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میں ریگتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ ہم نے اپنی اپنی میگزین بیلٹ میں سے دو چھوٹے مگر بڑے طاقتور پلاس نکالے اور بری برق رفتاری سے خاردار تار کو دو جگہ سے کاٹنا شروع کر دیا۔ پھر دونوں جگہوں کو ایک دوسرے سے ہلا دیا۔ یوں وہاں ایک دو تین فٹ چوڑا سوراخ بن گیا۔ ہم چاروں کمانڈو باری باری اس سوراخ میں سے دوسری طرف نکل گئے۔ آگے زمین نیچے اترائی میں چلی گئی تھی۔ یہاں گھاس تھی جو شبنم اور کمرے کی وجہ سے گیلی ہو گئی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب کے ساتھ ہم نے بھی اپنے آپ کو نشیب میں اس طرح گرا دیا کہ ہم رول کرتے یعنی لڑھکتے ہوئے نیچے جھاڑیوں میں جا لگے۔ اورنگ زیب جلدی سے اٹھا اور جھک کر پھاڑی کی دیوار کی جانب دوڑ پڑا، ہم بھی اس کے پیچھے دوڑے۔

پھاڑی کی دیوار میں اونچی اونچی سخت سرکنڈوں والی جھاڑیاں تھیں۔ ہم ان میں

اورنگ زیب نے آخری حکم دیا۔

”چیک یوئر ہینڈ گرنیڈز“

ہم نے میگزین بیلٹوں میں سے اپنے اپنے ہینڈ گرنیڈوں کے پن چیک کئے اور کہا۔
”اوکے سرا“

کمانڈو اورنگ زیب نے اپنا نقاب پوش چہرہ ہمارے قریب لاتے ہوئے کہا۔

”فاصلہ چھ چھ قدم۔ میں آگے جاؤں گا مجھ پر نگاہ رکھنا۔ جس طرف میں جاؤں تمہیں

بھی ادھر آنا ہو گا۔ میں بیٹھ جاؤں تمہیں بھی بیٹھ جانا ہو گا۔ میرے اشاروں کو غور سے دیکھتے رہنا۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہے۔ گو“

ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کے درمیان چھ چھ قدم کا فاصلہ ڈال کر چل پڑے۔ ہم بدستور جھک کر چل رہے تھے۔ کوئی پچاس قدموں کے فاصلے تک ہم اپنے گائیڈ کمانڈو اورنگ زیب کے پیچھے پیچھے جھک جھک کر چلتے رہے۔ اس کے بعد کمانڈو اورنگ زیب نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وہ زمین پر اونڈھا ہو کر لیٹ گیا۔ میں نے اسی طرح پیچھے اشارہ کر دیا۔ اب ہم چاروں زمین پر اونڈھے لیٹے کنیوں کے سہارے آگے ریگنے لگے۔ میں کمانڈو اورنگ زیب کے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس رات پھاڑی کے نشیب میں دور دور تک دھند پھیل ہوئی تھی۔ اس دھند نے ہمیں ایک بڑی اچھی اوٹ مہیا کر دی تھی۔ لیکن جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے دھند ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔ ہم سرچ لائٹ کی روشنی کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ ہمیں روشنی میں پھاڑی کی ڈھلان پر کھڑے چڑھ کے درخت نظر آنے لگے تھے۔ ہمیں دو تین فوجیوں کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ ہم زمین کے ساتھ چمٹ گئے۔ ہم نے ٹریننگ کے مطابق اپنے سانس تقریباً روک لئے تھے اور ناک کی بجائے منہ سے سانس لینے لگے تھے۔ کیونکہ ناک سے سانس لیتے وقت ہلکی آواز ضرور پیدا ہوتی ہے۔ مگر منہ سے سانس لیتے وقت اتنی آواز بھی نہیں پیدا ہوتی۔ ہم نے اپنے سیاہ نقاب پوش چہرے تھوڑے تھوڑے زمین سے اٹھا رکھے تھے۔ سرچ لائٹ کی روشنی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس روشنی کے علاوہ وہاں

تھی۔ اس نے چھت پر روشنی ڈالتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

”ہم اوپر بھارتی فوجی چھاؤنی کے نیچے سے گزر رہے ہیں۔“

غار میں نمی تھی اور فضا میں گھٹن کا احساس تھا مگر ہمیں اس قسم کے ماحول میں رہنے اور گزر جانے کی بھرپور ٹریننگ مل چکی تھی۔ سرنگ کی چھت ہمارے سروں سے کوئی ایک فٹ اونچی تھی۔ کئی جگہوں پر چھت پر لٹکتے ہوئے جالے ہمارے چہروں کے آگے آئے۔ سرنگ میں باہر کی نسبت سردی بہت کم تھی۔ بلکہ ہمیں ہلکی ہلکی گرمائش کا احساس ہو رہا تھا۔ سرنگ آگے جا کر ایک طرف کو مڑ گئی۔ یہاں زمین پر جگہ جگہ چھت پر سے اور دیواروں پر سے اکھڑا کھڑ کر گرے ہوئے پتھر اور مٹی پڑی تھی۔ ہم بڑی احتیاط سے چل رہے تھے۔

ایک جگہ جا کر سرنگ بند ہو گئی اور آگے دیوار آگئی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے وہاں رک کر پنسل ٹارچ کی روشنی چھت پر ڈالی اور کہا۔

”اوزار نکالو“

یہ اوزار جو فولاد کی چھوٹی گینتیاں تھیں ہمارے دو ساتھیوں کے پاس تھیں۔ انہوں نے فوراً فولادی گینتیاں نکالیں اور جہاں اورنگ زیب کھڑا تھا وہاں لپک کر آگئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے چھت پر ایک جگہ ٹارچ کی روشنی ڈالی اور کہا۔

”یہاں سے کھودنا شروع کر دو“

دونوں کمانڈوز نے چھت کے پتھروں میں گینتیاں پھنسا کر انہیں آہستہ آہستہ دھچکے دینے شروع کر دیئے۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

”کیا پتھر اکھڑ جائیں گے؟“

وہ میرے قریب کھڑا تھا۔ ہم دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ کہنے لگا۔

”یہ چٹانوں کی پہاڑی نہیں ہے۔ یہ مٹی گارے اور پتھروں کی پہاڑی ہے۔ میں نے اس کا پودا سروے کر رکھا ہے۔ چٹانی ٹیلے میں ہم سوراخ بھی نہیں ڈال سکتے تھے لیکن یہ پتھروں اور گارے سے مل کر پہاڑی بنی ہوئی ہے۔“

گھس گئے۔ شبنم اور رات کو پڑنے والے کمرے اور دھند نے ان سرکنڈوں کو بھی گیلا کر دیا ہوا تھا۔ اس لئے ان میں سے گھس کر دوسری طرف نکلنے وقت آواز پیدا نہ ہوئی۔ ہم پھر اوندھے لیٹ کر ریٹنگ لگے۔ کمانڈو اورنگ زیب اچانک ہماری نظروں سے غائب ہو گیا۔ میں نے سر تھوڑا سا اٹھا کر دیکھا۔ وہ اندھیرے اور اونچی اونچی جھاڑیوں میں مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میرے پیچھے دونوں کمانڈو بھی میرے قریب آکر زمین پر اس طرح اوندھے ہو کر رک گئے تھے۔ اچانک ہمیں الو کے بولنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ یہ ہمارا خاص اشارہ تھا کہ سب خیریت ہے آگے بڑھو۔ یہ آواز کمانڈو اورنگ زیب نے نکالی تھی۔ جدھر سے آواز آئی تھی ہم جتنی تیزی سے رینگ سکتے تھے رینگتے ہوئے اس طرف چلے گئے۔ ہم نے کمانڈو اورنگ زیب کو پہاڑی کے عین نیچے جھاڑیوں میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس نے ہمیں ہاتھ سے چلے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم تیزی سے اس کے پاس آگئے۔ اورنگ زیب جھاڑیوں کو ادھر ادھر ہٹا رہا تھا۔ پھر ان جھاڑیوں میں گھس گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے جھاڑیوں میں گھس گئے۔ جب جھاڑیوں سے باہر نکلے تو ہم ایک خشک جگہ پر آگئے تھے۔ یہاں زمین کی گھاس گیلی نہیں تھی۔ اندھیرا باہر کی نسبت یہاں زیادہ تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے پنسل ٹارچ روشن کر دی اور بولا۔

”کھڑے ہو کر آ جاؤ۔“

پنسل ٹارچ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ہم ایک تنگ غار میں تھے جس کی دیواروں کے باہر کو نکلے ہوئے پتھر نظر آرہے تھے۔ ہم کھڑے ہو کر چلنے لگے۔ یہ وہی سرنگ تھی جو پہاڑی کے عقب کی جانب سے مغل بادشاہوں کے زمانے میں کسی نہ معلوم مقصد کے لئے کھودی گئی تھی اور اب عرصہ دراز سے بند پڑی تھی اور پہاڑی ٹیلے کے اوپر بھارتی فوجیوں کو اس کی خبر نہیں تھی۔

اب ہم سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے تھے اور کمانڈو اورنگ زیب کے پیچھے قدم تھے چل رہے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب پنسل ٹارچ کی روشنی ڈال کر ہمیں راستہ دکھا رہا تھا۔ پنسل ٹارچ کی روشنی اگرچہ معمولی تھی مگر غار کے گہرے اندھیرے میں وہ بہت کافی

اس دوران چھت کے دو تین پتھر اکٹھا کر نیچے گرے۔ ہمارے ساتھی کمانڈو اس طرح گیتیاں چلا رہے تھے کہ ان کی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ گینتی کے ٹیکھے سرے کو چھت کے کسی پتھر کے کونے یا پہلو میں پھنساتے اور پھر پوری طاقت لگا کر اسے اوپر کو اکھاڑ ڈالتے۔ چھت کے چھوٹے بڑے پتھروں کے ساتھ اب مٹی بھی گر رہی تھی۔ میں نے اورنگ زیب سے پوچھا۔

”تمہارے خیال میں چھت کی موٹائی کتنی ہو گی؟“
اورنگ زیب نے کہا۔

”میرے حساب سے ہمیں زیادہ سے زیادہ پانچ فٹ اوپر تک چھت میں سوراخ نکالنا ہو گا۔ یہ پہاڑی تقریباً دو اڑھائی سو فٹ اونچی ہے۔ مگر اس چھت کے اوپر پہاڑی نہیں ہے بلکہ پہاڑی کے اندر جو قدرتی سرنگ بنی ہوئی ہے اس کا فرش ہے۔ ہمیں اس سرنگ کے اوپر جو سرنگ ہے اس میں جانا ہے۔ اسی سرنگ میں ایمونیشن کا ذخیرہ ہے۔“
چھت میں سوراخ گھرا ہوتا جا رہا تھا۔ یہ سوراخ کم از کم تین فٹ چوڑائی میں ڈالا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے دونوں کمانڈوز کو آرام کرنے کا موقع دیا اور میں اور کمانڈو اورنگ زیب گیتیاں لے کر چھت میں سوراخ ڈالنے لگے۔ واقعی پہاڑی گارے مٹی اور پتھروں کی آمیزش سے بنی ہوئی تھی۔ مٹی اور پتھر ہمارے اوپر گر رہے تھے مگر ہم بے فکر ہو کر پوری جانفشانی سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن کچھ دیر بعد ہمیں احساس ہوا کہ یہ کام اتنی جلدی ہونے والا نہیں ہے جتنا کہ ہم نے اندازہ لگایا تھا۔ جیسے جیسے چھت میں سوراخ اوپر کی طرف بڑھ رہا تھا پتھروں کی جسامت بڑی ہوتی جا رہی تھی اور انہیں اکھاڑتے ہوئے ہمیں کافی وقت صرف کرنا پڑ رہا تھا پندرہ بیس منٹ تک ہم محنت کرتے رہے۔ اس کے بعد پھر ہمارے دوسرے ساتھیوں نے یہ کام سنبھال لیا۔

میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

”یہ کام اتنی جلدی ہوتا نظر نہیں آرہا۔ کیس ایسا نہ ہو کہ باہر دن نکل آئے۔“
کمانڈو اورنگ زیب بھی فکر مند تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں پنل ٹارچ پکڑے اوپر چھت

پر روشنی ڈال رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”چاہے کچھ بھی ہو ہم اپنا مشن مکمل کئے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔“
چھت میں سے دو تین بڑے پتھر نیچے سرنگ میں گرے تو ان کی آواز پیدا ہوئی۔ میں نے کہا۔

”اوپر والی سرنگ میں یہ آواز جاسکتی ہے“

کمانڈو اورنگ زیب نے چھت پھاڑنے والے ساتھیوں سے کہا۔

”کوئی بڑا پتھر گرانے سے پہلے بتا دو۔ ہم انہیں نیچے سے کچھ کر لیں گے۔“
وہ مجھ سے متوجہ ہو کر بولا۔

”اوپر فوجی ایمونیشن ڈپو پر جہاں تک میرا خیال ہے کوئی فوجی گارڈ پھرہ نہیں دے رہا ہو گا۔ گارڈ کے سپاہی سرنگ کے باہر جہاں دروازہ لگا ہوا ہے وہاں پھرہ دے رہے ہوں گے۔ انہیں غار کے اندر آکر پھرہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ اوپر کسی وقت بھی کوئی انڈین فوجی چکر لگاتا آسکتا ہے۔“

اب اوپر سے کوئی بڑا پتھر اکٹھاتا تو ہمیں اشارہ کر دیا جاتا۔ میں دونوں ہاتھ آگے کر لیتا اور جیسے ہی پتھر اوپر سے گرتا میں اسے اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیتا اور آرام سے نیچے رکھ دیتا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اپنی گھڑی پر ٹارچ کی روشنی ڈالی کہنے لگا۔

”رات کا ڈیڑھ بجنے والا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ابھی دن نکلنے میں کافی وقت ہے“

اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”جلدی جلدی کرو“

چھت کا سوراخ فٹ ڈیڑھ فٹ کے قریب اوپر کو کھودا گیا تو ہاتھ پوری طرح سے اوپر نہیں جاتے تھے۔ اس کے بارے میں ہم نے سوچا تک نہیں تھا۔ چھت کے سوراخ کے اندر پتھروں اور مٹی کی چھت کا فاصلہ سرنگ کے فرش سے زیادہ ہوتا جا رہا تھا اور گینتی چلانے میں دقت پیش آرہی تھی۔ اس کا علاج یہ نکالا گیا کہ فرش پر جو بڑے بڑے پتھر گرے تھے ان کو جوڑ کر چھوٹا سا چوترہ بنا دیا گیا۔ ہم اس کے اوپر کھڑے ہو کر کام کرنے

روشنی میں ہمیں ایک دوسرے کے چہرے نظر آرہے تھے۔ وہ دوسری بار سوراخ کے اندر اوپر گیا اور چند سینڈ تک پتھری سل کو ٹھونک بجا کر دیکھتا رہا۔ پھر نیچے آکر کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے سل زیادہ چوڑی نہیں ہے ہم ایک کنارے سے اسے اکھاڑنے کی کوشش کریں گے۔“

اس نے اپنے ساتھی کمانڈو کو اشارہ کیا۔ وہ گینتی لے کر پتھروں کے اوپر کھڑا ہو کر سل کے کناروں کو اکھاڑنے لگا۔ نیچے صرف مٹی اور کنکریاں گر رہی تھیں۔ اورنگ زیب نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

”گزر صبح ہونے تک ہمارا مشن مکمل نہ ہوا تو ہمیں اگلی رات کے لئے بھی سرنگ میں بند رہنا پڑے گا۔“

میں نے کہا۔
”اگر ایسی صورت پیدا ہو گئی تو ہم سرنگ میں دن بسر کر لیں گے۔ ہم بھوکے پیاسے رہ سکتے ہیں۔“

اورنگ زیب اوپر چھت کو تک رہا تھا۔ اتنے میں اوپر سوراخ کے اندر جو کمانڈو کام کر رہا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”ایک طرف سے سل اکھڑ رہی ہے“
ہمارے چروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”شاباش! کام جاری رکھو“
تھوڑی دیر بعد میں نے اور اورنگ زیب نے سل کا جائزہ لیا۔ واقعی سل کا ایک

جانب سے سرا باہر نکل آیا تھا۔ اب اس کے آس پاس کی مٹی اور پتھر اکھاڑے جانے لگے۔ سل نیچے کو جھک آئی۔ ہم زور لگا کر اسے نیچے گرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ

اوپر سے بھاری قدموں اور کئی ٹریلر کے پیروں کے چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہم وہیں ساکت ہو گئے۔ اوپر سے فوجیوں کی باتیں کرنے کی دھیمی آوازیں آنے لگیں۔ کمانڈو

اورنگ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ کہنے لگا۔

لگے۔ لیکن اس طرح سے ہمارے پاؤں بار بار چبوترے سے ہل جاتے تھے اور کام کی رفتار میں کافی فرق پڑنے لگا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب نے پنسل ٹارچ فرش پر پتھروں کے سارے اس طرح نکاڈ، تھی کہ اس کا روشنی کا چھوٹا سا دائرہ اوپر چھت کے سوراخ پر پڑ رہا تھا۔ ہم دونوں بیٹھ

ہوئے تھے۔ ہمارے دونوں کمانڈو ساتھی پتھروں پر کھڑے چھت کے سوراخ میں کندھوا تک گھسے گیتیاں چلا رہے تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں اور

کمانڈو اورنگ زیب اپنی اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھٹیاں دیکھ لیتے تھے۔ رات کے دو بج گئے اور ابھی تک آدھا کام بھی نہیں ہوا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب بھی پریشان ہو گیا۔ اتنے

میں اوپر چھت کے سوراخ کے اندر سے ہمارے ساتھی نے سرگوشی میں آواز دی
”چھت میں پتھر کی لمبی چوڑی سل آگئی ہے۔ اس پر گینتی چلانے سے آواز پیدا ہو

گی۔“
کمانڈو اورنگ زیب پنسل ٹارچ لے کر اٹھا۔ اور خود سوراخ کے اندر روشنی ڈال کر

دیکھا۔ پھر مجھے ٹارچ دے کر کہا۔
”تم دیکھو۔“

میں نے سوراخ کے اندر روشنی ڈال کر چھت کو دیکھا۔ واقعی وہاں ایک چوڑی پتھر کی سل دائیں سے بائیں اور اوپر سے نیچے تک سرسبز چلی گئی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اوپر

یہاں پہلے کوئی روشندان ہوتا تھا جس پر بھاری سل ڈال کر بند کر دیا گیا ہے۔ میں نے ساتھی کمانڈو سے کہا۔

”گینتی مجھے دو“
میں نے گینتی پکڑ کر سل پر ہلکی سی ضرب لگائی تو آواز پیدا ہوئی۔ میں نے نیچے آکر

اورنگ زیب سے کہا۔
”سل بڑی سخت ہے۔ ہمیں کسی دوسری جگہ سے سوراخ کرنا ہو گا“

اورنگ زیب مجھے دیکھنے لگا۔ ہم نے نقاب الٹ رکھے تھے اور ٹارچ کی دھیمی دھیمی

”خدا کا شکر ہے ہم نے غلط جگہ پر چھت نہیں کھودی۔ مجھے یقین ہے یہاں سے بڑا
اوپر ایمونیشن ڈمپ ہے۔“

ہم سرگوشیوں میں بول رہے تھے۔ میں نے کہا۔
”میرا خیال ہے سرنگ کے اندر مزید گولہ بارود وغیرہ رکھا جا رہا ہے۔“

اورنگ زیب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم سب ہمہ تن گوش تھے اور ہمارے کان اس
سے آنے والی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ یہ آوازیں اتنی مدھم تھیں کہ فوجیوں
باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ یہ تین چار بھارتی فوجی تھے۔ پھر ایسے لگا جیسے ٹریلر
سکتا ہے۔“

اوپر سے بھاری کریت اتار کر دیواروں کے ساتھ لگائے جا رہے ہیں۔ یہ ایک نیا کام اور
شروع ہو گیا جس کے بارے میں ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی آپ
بتا چکا ہوں کہ کمانڈو پارٹی جب اپنے مشن پر نکلتی ہے تو عام طور پر اسے ٹارگٹ کے بارے
میں پوری معلومات بتا دی جاتی ہیں۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ ٹارگٹ پر بم

کے بعد صورت حال بدل جاتی ہے۔ پھر کمانڈو کو اپنی عقل کے مطابق فوری طور پر
دوسرے پلان پر عمل کرنا پڑ جاتا ہے۔ یہاں ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی صورت حال
گئی تھی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور چھت کے اوپر دوسری سرنگ کے ایمونیشن ڈمپیں۔ پھت کے سوراخ کا کام بھی تھوڑا رہ گیا ہے۔“

میں کوئی سامان رکھا جا رہا تھا اور یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ہم سوائے انتظار
کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اوپر دوسری سرنگ میں بھارتی فوجیوں کی موجودگی
میں چھت کی سل اکھاڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ آئیں گے۔ اگر ہم صبح ہونے تک آگئے تو ٹھیک ہے۔ نہ آئے تو سمجھ لینا کہ ہم
اوپر فوجی کب سامان رکھ کر واپس جاتے ہیں۔

رات کے تین بجے کا ٹائم ہو گیا اور ہم چاروں کمانڈو سرنگ کے اندر اندھیرے بوتے ہی اگر لاسکو تو ہمارے لئے کچھ بنے ہوئے پنے اور پانی کی چھاگل لے آئے۔ یاد
ایک دوسرے کے پاس خاموش اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب یہ لوگ فوجی ساز و سامان کھو۔ میں تمہیں جس طرف سے لایا ہوں اسی راستے سے واپس جانا۔ دشمن کی پٹروں
ڈپو میں رکھ کر واپس جاتے ہیں۔ اوپر سے برابر ٹریلر کے بار بار اندر آنے، سامان رکھنے ارٹھی سے خبردار رہنا۔ اور ہاں جاتی دفعہ خاردار تار کو جہاں سے ہم نے کاٹا تھا اسے وہاں
بھارتی فوجیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا اپنی جگہ پر لگا کر جوڑ دینا۔ تاکہ صبح کسی کو شک نہ پڑے۔ اوکے۔ گو۔“

”گلتا ہے آج رات ہم اپنا ٹارگٹ نہیں مار سکیں گے۔“

دونوں ساتھی کمانڈو نے چہروں پر نقاب کھینچ کر ڈالے اور خاموشی سے سرنگ میں

کمانڈو اورنگ زیب نے اس خیال سے ٹارچ بھادی ہوئی تھی کہ اس کے سیل خرچ
نہ ہوں۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔
”چار بجے باہر صبح کی روشنی پھیلنی شروع ہو جائے گی۔ ہمیں اوپر جا کر ڈائنامائٹ بھی
لگانا ہے اور یہاں سے نکلنا بھی ہے۔“

پھر اس نے اوپر سوراخ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”معلوم ہوتا ہے جہوں گیرین سے اسلحہ گولہ بارود کی سپلائی آئی ہے۔ یہ کام لمبا ہو
سکتا ہے۔“

استعمال کر رہی ہے دروازہ کس طرف ہے اور کیا وہ بند ہے۔ میں سرنگ کی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ سرنگ کے دہانے کی طرف بڑھا۔ اس وقت ٹین گن کا دھم سے لگی ہوئی تھی اور خیرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا جس کی ٹالی پر سائی لینسر لگا ہوا تھا۔ سرنگ چند قدم چلنے کے بعد مڑ گئی۔ میں بھی اسی طرف مڑ گیا۔ میرے سامنے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر سرنگ کا دہانہ تھا جس پر لوہے کا دروازہ لگا تھا جو بند تھا اور اندر کی جانب اوپر کر کے ایک بلب روشن تھا۔ دیواروں پر جگہ جگہ آگ بجھانے والے سلنڈر لگے ہوئے تھے۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ سرنگ میں کوئی بھارتی فوجی نہیں ہے اور دروازہ بھی بند ہے تو میں واپس ایمونیشن کے ذخیرے کے پاس آ گیا۔ یہاں بے پناہ گولہ بارود اور بم اور میزائل اور دیگر فوجی ہتھیاروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی سے جیکٹ کی جیب میں سے چھوٹی ڈبلی کے سائز کا پلاسٹک کا ٹائم بم نکالا اور ایک کریٹ کے پیچھے چپکا دیا۔ اس کے سامنے کی جانب دو سرا بم لگا دیا۔ بائیں جانب میری نظر پڑی تو مجھے سرنگ کا ایک شکاف دکھائی دیا۔ میں نے اس میں جھانک کر دیکھا تو اس میں پٹرول کے بڑے بڑے کین فرش سے چھت تک گئے ہوئے تھے۔ یہ بھارتی فوج کا عارضی پٹرول ڈمپ تھا۔ میں نے ایک بم وہاں بھی لگا دیا۔ میرے پاس صرف ایک بم رہ گیا تھا۔ میں نے وہ بھی وہیں لگا دیا۔ اب مجھے ان کے ٹائم ڈیوائس کے بٹن دبا کر سیکنڈوں کی سوئی کو اون کرنا تھا۔ ان بموں کا دورانیہ پچیس منٹ تھا۔ ان پچیس منٹوں کے اندر اندر مجھے اور کمانڈو اورنگ زیب کو اس علاقے سے جتنی دور نکل سکتے تھے نکل جانا تھا۔

میں نے اپنی گھڑی پر ٹائم دیکھا اور پھر پٹرول ڈمپ کے دونوں بموں کا بٹن دبا کر ٹائم ڈیوائس کی سوئی کو چلا دیا۔ سوئی آہستہ آہستہ ایک ایک سیکنڈ کے وقفے سے آگے حرکت کرنے لگی۔ اس کے فوراً بعد میں نے شکاف سے باہر آکر ایمونیشن کے کریٹوں پر لگائے ہوئے ٹائم بموں کے بٹن دبا کر ان کی سوئی بھی اون کر دی۔ ہمارا آدھا بلکہ آدھے سے زیادہ مشن مکمل ہو گیا تھا۔ اب ہمیں یہاں سے فرار ہونا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی بھارتی

واپس چلے گئے۔ اب سرنگ میں میں اور کمانڈو اورنگ زیب اکیلے رہ گئے۔ ہمارے کان سرنگ کی چھت پر اوپر کی آوازوں پر لگے تھے۔ عجیب اتفاق سے اوپر کی آوازیں غائب ہو گئیں۔ ٹریلر جن پر فوجی سازو سامان لا کر سرنگ کے اندر ایمونیشن ڈپو میں لایا جا رہا تھا اس کی آواز بھی دور جا کر ختم ہو گئی۔ اوپر ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ کمانڈو اورنگ زیب اٹھ کھڑا ہوا۔

”میدان صاف ہے۔ ہمیں چھت کی سل اکھینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ میں چاہتا ہوں آج کی رات میں ہی یہ مشن مکمل کر لیا جائے۔“

ہم باری باری سرنگ کی چھت کی سل اکھاڑنے میں لگ گئے۔ کوئی دس منٹ بعد سل ایک طرف سے نیچے جھک گئی۔ ہم نے بڑی احتیاط سے کہ آواز پیدا نہ ہو، سل کو تھام کر اکھاڑ دیا۔ سل کے اکھڑتے ہی اوپر سے بجلی کے بلب کی روشنی نیچے آنے لگی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے آہستہ سے کہا۔

”اللہ کا شکر ہے“

چاروں دھاکہ خیز بم میری میگزین جیکٹ میں تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں ہلکے سرگوشی میں اورنگ زیب سے کہا

”تم یہیں ٹھہرو گے۔ میں اوپر جا کر بم پلانٹ کروں گا۔“

ہم نے ہاتھوں سے پتھر اور مٹی ہٹا کر چھت میں اتنا سوراخ بنا دیا تھا کہ ایک آدمی اس میں سے نکل سکتا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب بیٹھ گیا۔ میں اس کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر چھت کے شکاف میں اوپر کو اٹھا اور بڑی احتیاط سے سراہر نکال کر دیکھا۔

یہ ایک اونچی چھت والی چٹانی سرنگ تھی۔ دیوار پر ایک جانب بجلی کا بلب روشن تھا۔ یہ دیکھ کر میرے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ سرنگ میں ایک جانب زمین لے کر چھت تک ایمونیشن کے بڑے کریٹ لگے ہوئے تھے۔ لمبی میزوں پر مختلف قسم کا فوجی اسلحہ کے بھی ڈھیر لگے تھے۔ سرنگ خالی تھی۔ میں اوپر چڑھ آیا۔ سب

ہیلے میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سرنگ کا جس کو بھارتی فوج ایمونیشن ڈپو کے طور

”جس طرف سے نکل سکتے ہو نکل جاؤ“

میں نے اسے دیکھا کہ اس نے ایک کھائی میں چھلانگ لگا دی تھی۔ میں دوسری جانب کو دوڑا۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ اچانک چار بھارتی فوجیوں نے شین گنیں تان کر مجھے دبوچ لیا اور گھسیٹتے ہوئے پہاڑی کے اوپر لے گئے۔ وہ مجھے ساتھ ساتھ ٹھڈے بھی مار رہے تھے۔ کچھ اور فوجی سپاہی بھی ادھر ادھر سے نکل آئے۔ وہاں شور مچ گیا۔ اوپر والی مشین گن پوسٹ سے فائرنگ جاری تھی۔

”کمانڈو ہیں۔“

”ایک پکڑا گیا ہے“

”دوسرے بھی ہوں گے۔“

اس قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے پہاڑی کے پہلو میں ایک گن پوسٹ پر لے جا کر میری تلاشی لی گئی۔ میری شین گن۔ ہینڈ گرنیڈ اور میگزین بھارتی فوجیوں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ میرے ہاتھ اوپر تھے۔ ایک سکھ فوجی پوسٹ سے نکل کر آگیا۔ اس نے مجھے گالی دی اور کہا۔

”کتنے کمانڈو تھے؟“

میں نے کہا۔

”میں اکیلا آیا تھا۔ میرے ساتھ کوئی نہیں تھا۔“

اس نے میرے منہ پر زور سے طمانچہ مارا اور گالیاں دینے لگا۔

”ابھی معلوم ہو جاتا ہے چلو اسے اوپر لے چلو۔“

چار سپاہیوں نے مجھے دبوچ لیا اور مجھے کھینچتے ہوئے پہاڑی کی چڑھائی پر اوپر لے جانے لگے۔ اس وقت آسمان پر پچھلے پہر کے نور کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ میری ایک جانب پہاڑی کی دیوار تھی۔ دوسری جانب میں نے دیکھا کہ کوئی پچاس فٹ نیچے ایک ٹالہ بہہ رہا تھا۔ رات کے آخری پہر کی ہلکی روشنی میں مجھے ٹالے کا پانی صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسی وقت ایک فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ میری مجبوری تھی۔ اگر میں یہ فیصلہ نہ بھی

سپاہی صبح تک سرنگ کے اندر نہیں آئے گا۔ کم از کم پچیس منٹ تک کوئی نہیں آئے گا۔ کیونکہ انہوں نے ایمنیشن سپلائی جو اندر رکھنی تھی وہ رکھ چکے تھے۔ میں چھت کے سوراخ میں سے نیچے اتر گیا۔ میرے اترتے ہی کمانڈو اورنگ زیب نے سرگوشی میں پوچھا۔

”سب ٹھیک ہے؟“

میں نے کہا۔

”سب ٹھیک ہے۔ میں نے چاروں بم لگا کر انہیں اون کر دیا ہے۔ اب یہاں سے

نکل چلو“

ہم تیز تیز قدموں کے ساتھ پرانی سرنگ کے دہانے کی طرف چلنے لگے۔ اورنگ زیب پنسل ٹارچ سے روشنی کر رہا تھا۔ سرنگ کے دہانے پر جا کر اس نے ٹارچ بجھا کر جیب میں رکھ لی۔ ہم نے شین گنیں ہاتھوں میں پکڑ لیں اور سرنگ کے دہانے میں سے رینگ کر باہر جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں نکل آئے۔ سامنے باہر سرچ لائٹ کا سفید دائرہ آگے کو جا رہا تھا۔ ہم رک گئے۔ جب روشنی کا دائرہ ہم سے آگے نکل گیا تو ہم دوڑ پڑے۔

بس یہ ہماری غلطی تھی۔ ہمیں خاردار تاروں تک رینگ کر جانا چاہتے تھا۔ لیکن ہم لگانے کے بعد ہم چاہتے تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے نکل جائیں۔ دور ہو جائیں۔ جیسے ہی ہم دوڑے ایک طرف سے کسی فوجی نے چلا کر کہا۔

”ہالٹ“

ہم دوڑتے گئے۔ ایک دم کسی مشین گن پوسٹ سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے چیختی ہوئی گزرنے لگیں۔ ساتھ ہی ٹیلے کی کسی پوسٹ پر سے روشنی راؤنڈ فائر ہونے لگے۔ یہ روشنی کی مدد سے آہستہ آہستہ نیچے آتے تھے اور یوں فضا میں دیر تک روشنی پھیلی رہتی۔ سارا علاقہ دن کی طرح روشن ہو گیا۔ ہم زمین پر لیٹ گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

رات کی تاریکی باقی تھی۔ نالے کے اوپر دھند بھی پھیلی ہوئی تھی۔ نالے کا تیز پانی مجھے وہاں سے نکال کر دور لے گیا۔ آگے ایک اور پہاڑی آگئی۔ نالہ اس کے پہلو سے ہو کر دوسری طرف نشیب میں چلا گیا تھا۔ یہاں پانی کا بہاؤ پہلے سے زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ نالہ گہرا تھا اور میرے پاؤں نیچے نہیں لگ رہے تھے۔ میں ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا تیرتا چلا جا رہا تھا۔

فائرنگ کی آوازیں مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ آسمان پر بار بار روشنی راؤنڈ فائر کئے جا رہے تھے جن کی روشنی سے آسمان میرے پیچھے روشن ہو رہا تھا۔ مگر میں خطرے کی سرحد پار کر چکا تھا۔ نالہ دو تین ٹیلوں کے پہلو سے چکر کاٹ کر ایک جگہ درختوں کے جھنڈوں میں آگیا۔ میں نے دیکھا۔ نالے کے کنارے مجھ سے کافی دور تھے۔ درخت کناروں پر جھکے ہوئے تھے۔ میں تیرتا ہوا کنارے کی طرح بڑھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں بھارتی چھاؤنی والی پہاڑی سے کافی دور نکل آیا ہوں۔ پہاڑی علاقے میدانِ علاقوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں ایک دو پہاڑیوں پیچھے نکل جائیں تو نہ صرف یہ کہ کئی میل کا فاصلہ پڑ جاتا ہے بلکہ سمت بھی بدل جاتی ہے۔

کنارے پر آکر میں نالے سے باہر نکل آیا۔ میری میگزین جیکٹ اور پتلون پانی میں شرابور تھی۔ جیکٹ میں سے میگزین بھارتی فوجیوں نے نکال لیا تھا۔ میں درختوں میں ایک طرف تیز تیز چلنے لگا۔ آسمان پر صبح کا اجالا اب نمایاں ہونے لگا تھا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ آگے ایک کھائی آگئی۔ میں اس میں اتر گیا اور دوسرے کنارے پر سے باہر نکل آیا۔ آگے ایک اور گہری کھڈ تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا صبح کے ہلکے ہلکے اجالے میں مجھے کھڈ کی تہ میں درخت آگے ہوئے نظر آئے۔ کھڈ کافی گہری تھی۔ دوسرا آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نشیب میں جھاڑیوں کو پکڑ کر نیچے اترنے لگا۔ کھڈ کی تہ میں بھی ایک نالہ بہہ رہا تھا مگر یہ چھوٹا سا پہاڑی نالہ تھا۔ میں اس میں سے گزر گیا۔ سامنے کھڈ کی دوسری دیوار تھی۔ اس میں اوپر جانے کے لئے جھاڑیوں اور درختوں میں ایک پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ چڑھائی زیادہ سیدھی نہیں تھی۔ میں چڑھائی چڑھ کر کھڈ سے باہر آیا تو میری نظر ایک چھوٹے سے ہموار قطعے پر پڑی۔ یہ کھیت تھی۔ کھیتوں کے پیچھے درختوں میں

کرتا تو میری موت یقینی تھی۔ کیونکہ میں نے ایمونیشن کے ذخیرے اور پٹرول کے ڈمپ میں جو چار طاقتور بم لگائے تھے ان کے پھٹنے میں پندرہ بیس منٹ ہی رہ گئے تھے۔ اس کے بعد اس پہاڑی کو آتش فشاں پہاڑی کی طرح پھٹ پڑنا تھا اور وہاں پر موجود ہر شے کے پر نیچے اڑ جانے تھے۔

میری نگاہ نیچے بہتے ہوئے نالے پر تھی۔ دو آدمیوں نے میرے ایک ایک بازو سے مجھے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے نیچے نالے میں کود جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پہاڑی نالے زیادہ گہرے نہیں ہوتے اور ان میں پتھر بھی ہوتے ہیں۔ اس میں گرنے سے میری موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ لیکن اس میں ایک فی صد جان بچ جانے کا امکان ضرور تھا جب کہ پہاڑی پر موجود رہنے کی صورت میں زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بھارتی فوجی مجھے گالیاں دیتے ٹھڈے مارتے کھینچتے ہوئے اوپر لئے جا رہے تھے۔ میں نے آخری بار نیچے پہاڑی نالے کی طرف دیکھا۔ چند قدموں کے فاصلے پر پہاڑی سڑک مڑ جاتی تھی اور نالے سے دور ہو جاتی تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا اسی وقت کرنا تھا۔ میں کوئی عام انارڈی آدمی نہیں تھا۔ تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ میرے لئے اپنے آپ کو ان فوجیوں سے چھڑانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے افراتفری میں میرے ہاتھ پیچھے نہیں باندھے تھے۔ جیسے ہی پہاڑی کا موڑ شروع ہوا میں نے ایک زبردست جھٹکے سے ایک سپاہی سے اپنا بازو چھڑایا۔ ساتھ ہی دوسرے جھٹکے سے دوسرے فوجی کے پیٹ میں لات مار کر اپنے آپ کو چھڑایا اور نیچے نالے میں چھلانگ لگا دی۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا جتنی جلدی ہم آنکھ جھپکتے ہیں۔ میں نالے کے ٹھنڈے پانی میں گرا۔ پانی گہرا تھا۔ اوپر شور مچ گیا اور مجھ پر شین گنوں ریوالوروں اور مشین گن کی فائرنگ ہونے لگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے بچانا تھا۔ نالے کے پانی کا بہاؤ وہاں اتنا تیز تھا کہ دیکھتے دیکھتے میں پانی میں لڑھکتا ہوا پتھروں کے درمیان آگے نکل گیا۔ آگے نالے میں بڑے بڑے پتھر باہر نکلے ہوئے تھے۔ اگر میں ذرا پیچھے چھلانگ لگاتا تو ان پتھروں پر گرنے سے میری فوراً موت واقع ہو جاتی۔ دن کا اجالا ابھی پوری طرح سے نہیں ہوا تھا اور

سرخ لگا لیتے۔

میں پریشانی کے عالم میں جوار کے کھیت میں چپ چاپ بیٹھا تھا کہ اچانک زمین اس طرح لرزی جیسے زلزلہ آگیا ہو اس کے ساتھ ہی ایک مہیب دھماکہ ہوا۔ پھر ایک اور اس سے بھی زیادہ مہبت ناک دھماکہ ہوا۔ پھر دھماکے شروع ہو گئے۔ زمین ہل رہی تھی۔ میں دوڑ کر کھیت سے باہر نکل آیا۔ میں نے اس طرف دیکھا جدھر فوجی چھاؤنی والی پہاڑی تھی۔ وہاں پہاڑی کی بجائے صرف آگ کے شعلے اور دھواں ہی دھواں تھا۔ آسمان دھوئیں میں سیاہ ہو رہا تھا۔ شعلے آسمان کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ہر دھماکے کے بعد یہ شعلے کبھی سرخ اور کبھی نیلی رنگت اختیار کر کے اور زیادہ اوپر کو بلند ہو رہے تھے۔ ہم نے ٹارگٹ مار لیا تھا۔ ہمارا مشن کامیاب ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کمانڈو اور نگ زیب ضرور ہائیڈ آؤٹ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہو گا۔

میراجی چاہا کہ میں دونوں ہاتھ بلند کر کے اللہ اکبر کا نعرہ لگاؤں۔ لیکن میں ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے بھارتی فوجی جیپ کی آمد اس بات کا ثبوت تھا کہ یہاں آس پاس بھارتی فوجی چوکیاں قائم ہیں میں ایک بار پھر کھیت میں گھس گیا اور سوچنے لگا۔ کس طرف کو جانا چاہئے۔ مجھے سمت کا اندازہ نہیں رہا تھا کہ ہماری خفیہ کمیں گاہ کس طرف ہے۔ میں نے اللہ کو یاد کیا اور مشرق کی طرف چل پڑا۔ میں ایک کھیت سے نکل کر دوسرے کھیت میں گھسا ہی تھا کہ مجھے دو کشمیری کسان نظر آئے۔ ان میں ایک وہی کشمیری کسان تھا جو کچھ دیر پہلے لکڑی کے مکان کے باہر بھارتی فوجیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ فصل میں سے دونوں کشمیری مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑی اڑ چکی تھی۔ ساتھ ہی بھارتی فوجیوں اور ساری کی ساری بھارتی چھاؤنی کے پرچے اڑ چکے تھے۔ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہلکے ہلکے دھماکے اب بھی جاری تھے۔ دونوں کشمیری کسان جن میں سے ایک بوڑھا آدمی تھا اور دوسرا نوجوان تھا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھیت کی مینڈھ پر کھڑے اس طرف دیکھ رہے تھے جس طرف پہاڑی پھٹی تھی اور آسمان پر دھواں پھیلا ہوا تھا۔

ایک لکڑی کا مکان بنا ہوا تھا۔

میں اس طرف نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ ہو سکتا تھا وہاں پولیس یا فوج کا کوئی خیر کسان کے بھیس میں موجود ہو۔ میں جوار کے کھیت کی مینڈھ پر چلنے لگا۔ اب دن نکل آیا تھا اور اجالا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ جوار کی فصل اونچی تھی اور میں اس کی اوٹ میں چل رہا تھا۔ مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک جیپ کے سنارٹ ہونے کی آواز آئی۔ یہ فوجی جیپ ہی ہو سکتی تھی۔ میں وہیں فصل میں گھس گیا اور جوار کے ٹانڈوں کو تھوڑا ہٹا کر جس طرف سے جیپ کے انجن کی آواز آرہی تھی اس طرف دیکھنے لگا۔ کھیتوں کے کنارے دور درختوں کے نیچے جو لکڑی کا مکان مجھے نظر آیا تھا وہاں ایک فوجی جیپ کھڑی تھی۔ ایک فوجی جیپ میں بیٹھا تھا۔ دو فوجی لکڑی کے مکان کے باہر ایک کشمیری کسان سے باتیں کر رہے تھے۔ پھر وہ دونوں فوجی سپاہی بھی جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ دوسری طرف پہاڑی راستے کی جانب نکل گئی۔

اس کا مطلب تھا میں ابھی خطرے سے باہر نہیں تھا۔ پہاڑی ٹالے سے میں کافی دور نکل آیا تھا۔ مجھے یہاں تک آئے اور ٹالے کے تیز ہواؤ کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ میں منٹ لگے ہوں گے۔ میں حیران تھا کہ ابھی تک میرے لگائے ہوئے بموں کا دھماکہ کیوں نہیں ہوا۔ میں فصل کے اندر بیٹھ گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ مجھے بم لگائے آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ بم ابھی تک بلاسٹ نہیں ہوئے تھے۔ میں نے مایوسی کے عالم میں سر جھکا لیا۔ بموں کے ٹائم ڈیوائس یا ڈی نیٹروں میں ضرور کوئی مینیکیکل خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ ورنہ یہ ناممکن تھا کہ ٹھیک ٹائم پر بم نہ پھٹتے۔ اپنے مشن کی ناکامی پر مجھے سخت افسوس ہوا۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب ہمیں دوبارہ اس مشن پر نکلنا تھا اور پہاڑی کے ایمونیشن کو اور ساتھ ہی چھاؤنی کی بارکوں اور پوسٹوں میں موجود دو ہزار کے قریب بھارتی فوجیوں کو کسی دوسرے طریقے سے موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ کیونکہ یہ بات یقینی تھی کہ دن کے وقت ایمونیشن ڈپو میں فوجیوں نے ضرور آنا تھا اور انہیں فوراً سرنگ میں پڑا ہوا شگاف نظر آجاتا اور پھر وہ ڈی نیکیٹر سے میرے لگائے ہوئے ناکارہ بموں کا بھی

اور میں کھیت میں سے باہر نکل آیا۔ نوجوان کشمیری بولا۔
”بابا! یہ کشمیری نہیں ہے۔“

اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ٹوٹی پھوٹی کشمیری زبان میں بات کی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

”میں پاکستانی کمانڈو ہوں۔ اس پہاڑی والی بھارتی چھاؤنی کو ہم نے ہی اڑایا ہے۔“
میرے لئے ان پر اپنا آپ ظاہر کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ بوڑھے کشمیری نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ بار بار میرا ہاتھ چوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔
”پاکستان۔ اللہ اکبر۔ پاکستان ہماری جان۔ اللہ اکبر۔“

نوجوان کشمیری لڑکے کے سرخ و سپید چہرے پر مسرت کھلی ہوئی تھی اور وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کا ہیرو ہوں۔ بوڑھے کشمیری نے کہا۔

”میرے ساتھ آؤ بیٹا۔ یہاں اس وقت کھڑے رہنا ٹھیک نہیں۔“

درختوں کے نیچے جو لکڑی کا مکان تھا وہ مجھے اس میں لے گیا۔ اندر غریبانہ ماحول تھا۔ لکڑی کے فرش پر میلا سا مندمہ بچھا تھا۔ ایک طرف سادار اور پیالیاں پڑی تھیں۔ اندر آکر اس نے نوجوان کشمیری سے کہا وہ دروازہ بند کر کے باہر چوکس کھڑا رہے۔ لڑکا باہر نکل گیا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ بوڑھا کشمیری مجھ سے اپنے خاص لمبے میں اردو میں باتیں کرنے لگا۔ جب میں نے اسے پوچھا کہ تھوڑی دیر پہلے اس کے پاس جو بھارتی فوجی آئے تھے وہ اس سے کیا باتیں کر رہے تھے۔ بوڑھے کشمیری نے کہا۔

”وہ ہمارے مجاہد کمانڈو کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ ادھر پاکستانی کمانڈو آئے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ یہاں میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ ہم غریب کسان مجبور و بے کس ہیں۔ جب تک ہم غلامی کی زنجیریں توڑ کر بھارتی فوجی بھیڑیوں سے نجات حاصل نہیں کر لیتے ہم آزادی کا سانس نہیں لے سکتے۔ وہ جاتی دفعہ کہہ گئے تھے کہ اس طرف کوئی اجنبی آدمی چلتا پھرتا نظر آئے تو ہماری پوسٹ پر آکر خبر کرنا۔ میں نے کہہ دیا کہ ضرور خبر کر دوں گا۔ اور پھر وہ چلے گئے۔ اب ان کی چھاؤنی برباد ہو گئی ہے۔ وہ

بوڑھے کشمیری کسان نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے کشمیری زبان میں کہا۔
”دشمن کو مار دیا ہے۔“

میں تھوڑی تھوڑی کشمیری بول لیتا تھا مگر کشمیری زبان سمجھ پوری لیتا تھا۔ نوجوان کشمیری نے کہا۔

”بابا! یہ کام ہمارے مجاہد کمانڈو نے کیا ہے۔ کشمیر آزاد ہو گا۔ بھارتی فوجی یہاں سے بھاگ جائیں گے۔“
کشمیری کسان نے کہا۔

”بھائیں گے نہیں تو ہمارے مجاہد انہیں جلا کر بھسم کر دیں گے“

ان کی باتوں سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ محب وطن کشمیری ہیں اور ان میں کوئی پولیس یا انڈین فوج کا مخبر نہیں ہے۔ میں ان سے مدد لے کر اپنے ہائیڈ آؤٹ کی طرف جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کے باوجود میں کھیت سے باہر نکل کر ان سے ہم کلام ہوتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ کمانڈو یونہی کسی کے سامنے اپنا آپ ظاہر نہیں کیا کرتے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میرے قریب سے ایک خرگوش نکل کر بھاگا۔ اس کے بھاگنے سے فصل ہلی تو دونوں کشمیریوں نے کھیت کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اونچی فصل نے مجھے چھپا رکھا تھا۔

بوڑھے کشمیری نے کہا

”کون ہو؟“

اور وہ دونوں آگے بڑھ کر جہاں میں چھپا ہوا تھا وہاں آگئے۔ اب میں انہیں صاف نظر آ رہا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری فوجی جیکٹ اور پتلون کو وہ غور سے دیکھنے لگے۔
بوڑھے کشمیری نے کشمیری زبان میں مجھ سے پوچھا۔

”مجاہد ہو؟“

میں نے کہا۔

”الحمد للہ مجاہد ہوں“

چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک حقہ بھی پڑا تھا۔
بوڑھے کشمیری نے کہا۔

”اس غار میں چھپ جاؤ۔ میں تمہیں یہاں کھانا پانی چائے سب کچھ پہنچاتا رہوں گا۔“

میں شکاف میں گھس گیا جو غار کی طرح تھی مگر چھ سات گز لمبی ہی تھی۔ اس میں ایک طرف دھان کے خشک پولے اور دوسری طرف جلانے والی لکڑیوں اور درختوں کی سوکھی شاخوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں ان کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ محب الوطن کشمیری بولا۔

”میں تمہارے لئے ناشتہ لاتا ہوں۔“

جاتے ہوئے وہ شکاف کے منہ کے آگے دونوں چارپائیاں ایک دوسری کے اوپر کھڑی کر گیا۔ میری جیکٹ اور پتلون اتنی دیر میں باہر کی ہوا اور جسم کی گرمی کے باعث کافی سوکھ چکی تھی۔ میں لکڑیوں کے ڈھیر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کمانڈو اورنگ زیب کہیں گاہ میں ضرور زندہ سلامت پہنچ گیا ہو گا۔ اور پہاڑی کے دھماکے اور ایمنونیشن پھینکنے کی میب آوازیں اس نے اور کمانڈو شیروان نے بھی سنی ہوں گی اور وہ اپنے مشن کی کامیابی پر ضرور خوش ہو رہے ہوں گے۔ لیکن انہیں میری فکر ضرور ہو گی۔ کیونکہ کمانڈو اورنگ زیب نے میری طرف بھارتی فوجیوں کو بوڑھے اور بلند آواز میں مجھے ہاٹ کہتے ضرور سن لیا ہو گا۔ تاہم انہیں اس بات کا بھی یقین ہو گا کہ میں ایک تجربہ کار تربیت یافتہ کمانڈو ہوں اور اگر مجھے آنا فانا شوٹ نہ کر دیا گیا تو میں بھارتی فوجیوں کی قید سے نکل کر ان کے پاس ضرور پہنچ جاؤں گا۔

تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی تلاش میں اس طرف ضرور آئیں گے۔“
میں نے پوچھا۔

”بابا! کیا تمہیں معلوم ہے کہ ان بھارتی فوجیوں کی پوسٹ یہاں سے کس طرف ہے اور کتنی دور ہے۔“
بوڑھے کشمیری نے کہا۔

”ان کی فوجی چوکی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اسی لئے میں تمہیں یہاں لے آیا ہوں۔ مجھے خطرہ ہے کہ وہ اس طرف ضرور آئیں گے۔“

میں خود بھی ابھی وہاں سے باہر نکلنے اور جنگل میں جانے کا خطرہ مول لیتا نہیں چاہتا تھا۔ ایمنونیشن ڈپو اور پوری فوجی چھاؤنی کے تباہ ہو جانے کے بعد اس علاقے کی پوری فوج الٹ ہو گئی ہو گی۔ اور بقول کشمیری بوڑھے کے ان کی ایک فوجی چوکی تو قریب ہی تھی۔ میں بے بابا سے کہا۔

”میں ابھی یہاں سے نکل کر اپنے خفیہ ٹھکانے کی طرف نہیں جانا چاہتا کیا یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میں آج کا دن چھپ کر گزار دوں۔ میں رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

بوڑھا کشمیری کچھ سوچ کر بولا۔

”ایک جگہ ہے۔ ہم وہاں پہاڑی کی کھوہ میں اناج اور سوکھی لکڑیاں رکھتے ہیں۔“
میں نے کہا۔

”یہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے؟“
وہ کہنے لگا۔

”دور نہیں ہے۔ مکان کے پیچھے ہی ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔“

وہ مجھے مکان کے پیچھے لے آیا۔ یہاں ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ چھوٹا سا باڑہ تھا جس میں دو تین بکریاں بھی نظر آئیں۔ بازے کے قریب سے ایک راستہ اوپر پہاڑی کی طرف جاتا تھا۔ اس طرف پہاڑی میں ایک جگہ قدرتی غار سا بنا ہوا تھا۔ اس کے سامنے دو

باہر مکان کے دروازے پر فوجی جیپ کھڑی تھی۔ جیپ میں مشن گن لگی تھی اور دو فوجی بیٹھے تھے۔ ایک فوجی نے بوڑھے کشمیری کے سر کے ساتھ شین گن کی ٹالی لگا کر غصے میں کہا۔

”تم جھوٹ بولتے ہو۔ اس نے نالے میں چھلانگ لگائی تھی۔ وہ اسی طرف سے گزرا ہے تاؤ وہ یہاں سے کس طرف گیا ہے؟“

بوڑھا کشمیری دھیمی آواز میں کچھ کہنے لگا۔ ظاہر ہے وہ یہی کہہ رہا ہو گا کہ جس کمانڈو کے بارے میں آپ پوچھ رہے ہیں وہ ادھر نہیں آیا۔ خدا جانے وہ کب سے اسے زد و کوب کر رہے تھے۔ فوجی نے شین گن اوپر کرتی اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔

”چلو اسے آگے تلاش کرتے ہیں“

پھر اس بھارتی فوجی نے بوڑھے کشمیری کو پاؤں سے پیچھے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

”اگر وہ کمانڈو ادھر آیا تو ہمیں اسی وقت اطلاع دینا نہیں تو ہم تمہیں اور تمہارے بیٹے کو شوٹ کر دیں گے۔“

وہاں بوڑھے کا بیٹا شیر علی مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ تینوں فوجی صحن سے نکل کر جیپ میں سوار ہوئے اور جیپ آگے نکل گئی۔ مجھے سخت افسوس ہو رہا تھا کہ میری وجہ سے اس نیک دل محب الوطن بوڑھے کشمیری کو تشدد کا نشانہ بننا پڑا۔ لیکن میں اگر وہاں نہ بھی آتا تو بھارتی فوجی اس سے پوچھ گچھ کرنے وہاں ضرور آتے۔ فوجیوں کے جانے کے بعد بوڑھا کشمیری اٹھ کر مکان کے اندر چلا گیا۔ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ دن کے سوا بارہ بج رہے تھے۔ میں کافی دیر سوتا رہا تھا۔ ان بھارتی فوجیوں کی موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ علاقے میں فوج نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ لیکن بوڑھے کشمیری پر آئی ہوئی بلا ٹل گئی تھی اس کے لئے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ورنہ درندہ صفت بھارتی فوجی بوڑھے کو ہلاک بھی کر سکتے تھے۔

میں لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ رات کے اندھیرے میں مجھے کس طرف سے ہو کر واپس اپنے ہائیڈ آؤٹ میں جانا چاہئے۔ آدھا گھنٹہ گزرنے

@ تنے میں بوڑھا کشمیری میرے لئے ناشتہ لے کر آگیا۔

سبز چائے کے ساتھ روٹی اور مکھن تھا۔ میں نے شکریہ ادا کر کے ناشتہ کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ اس گھر میں اکیلا رہتا ہے۔ اس کی بیوی کو فوت ہوئے چھ سال بیت گئے ہیں۔ اس کے پاس تھوڑی سی زمین ہے۔ اس پر گزر بسر ہوتی ہے۔ کہنے لگا۔

”میں نے شیر علی کو یہ دیکھنے کے لئے بھارتی فوج کی چوکیوں کی طرف بھیجا ہے کہ وہاں کیا صورت حال ہے ابھی تک ادھر کوئی نہیں آیا۔ تم فکر نہ کرو۔ یہاں کوئی تمہیں دیکھنے نہیں آئے گا۔ میں سارا دن ہی گھر پر رہوں گا۔“

کچھ دیر وہ مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ شیر علی کے آنے کے بعد مجھے صورت حال سے باخبر کرنے کے لئے پھر آئے گا۔ شیر علی اس کے بیٹے کا نام تھا۔ میں نے سوچا کہ موقع ملا ہے تو کچھ دیر کے لئے سو جانا چاہئے۔ چنانچہ میں نے کلمہ پڑھ کر آنکھیں بند کیں اور اس کے بعد سو گیا۔

باہر کچھ شور ہوا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دو تین آدمی اونچی اونچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میں لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے سے نکل کر شکاف کے منہ کے پاس آکر باہر دیکھنے لگا۔ یہاں سے بوڑھے کشمیری کے مکان کا آدھا صحن

ذرا نشیب میں صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے تین ہری وردیوں والے بھارتی فوجیوں کو دیکھا جنہوں نے شین گنیں اٹھائی ہوئی تھیں۔ بوڑھا کشمیری ان کے درمیان زمین پر بیٹھا تھا۔

کے بعد بوڑھا کشمیری میرے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔
 ”انڈین ملٹری کے آدمی آئے تھے مگر میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ وہ چاہے مجھے
 شوٹ کر دیتے مگر میں انہیں کبھی نہ بتاتا کہ مجاہد کمانڈو پہاڑی والے غار میں ہے۔“
 میں نے کہا۔

”بابا! مجھے معاف کر دینا۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے“
 بوڑھے کشمیری نے اللہ اکبر اللہ اکبر پکار کر کہا۔
 ”بیٹے تم مجاہدوں پر میری ہزار بار جان قربان۔ میں نے تو اپنے بیٹے شیر علی کو کشمیر
 کے جہاد میں شریک ہونے کی اجازت دے دی ہے۔ وہ کب سے مجھ سے اجازت مانگ رہا
 تھا۔ تمہیں دیکھ کر اس کے دل کا جذبہ زیادہ ہو گیا تھا۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ اس خیال سے میر
 نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ اب میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ جاؤ وطن کی آزادی کا
 خاطر دشمنوں سے جہاد کرو۔“

میں نے بوڑھے کشمیری کو نہیں بتایا تھا کہ میں یہ سارا واقعہ یہاں سے دیکھ رہا تھا۔
 میں نے پوچھا۔
 ”تمہارا بیٹا شیر علی کیا خبر لایا تھا؟ وہ کہاں ہے؟“
 بابا نے کہا۔

”یہی میں تمہیں بتانے آیا تھا۔ شیر علی نے بتایا ہے کہ آس پاس کے سارے علاقے
 میں انڈین ملٹری پھیلی ہوئی ہے۔ قصبے میں گھر گھر کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ فوج چھ سات
 جوانوں کو پکڑ کر بھی لے گئی ہے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں کشمیری مجاہدین انہیں شب
 خون مار کر چھڑا کر لے جائیں گے۔ ایسا یہاں کشمیر میں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے کشمیری
 مجاہدوں نے بھارتی فوجیوں کو اس قدر خوف زدہ کر دیا ہوا ہے کہ وہ کبھی شہریاں گاؤں میں
 اکیلے نہیں نکلتے۔ ہمیشہ دو دو یا تین تین کی ٹولیوں میں نکلتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے
 مجاہد گھات لگا کر انہیں بھون ڈالتے ہیں۔“

میں بوڑھے کشمیری کو اپنے ہائیڈ آؤٹ کا محل وقوع کسی حالت میں بھی نہیں بتا سکتا

تھا۔ مجھے اتنا یاد تھا کہ جہاں سے ہم ایک پہاڑی نالے کے چھوٹے سے لکڑی کے پل کی
 طرف مڑتے ہیں وہاں ایک طرف خوبانیوں کا بہت بڑا باغ ہے۔ میں نے بابا کو اس باغ کے
 بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

”اگر میں اس باغ تک پہنچ جاؤں تو میں اپنے ساتھی مجاہدوں سے جا کر مل سکتا ہوں۔
 کیونکہ وہاں قریب ہی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ میرا کوئی نہ کوئی کمانڈو ساتھی اس گاؤں
 میں میرا ضرور انتظار کر رہا ہو گا“
 بوڑھا کشمیری کہنے لگا۔

”میں خوبانیوں کے باغ سے واقف ہوں۔ میں شیر علی کو تمہارے ساتھ کر دوں گا وہ
 تمہیں بڑے خفیہ راستے سے وہاں تک رات کو لے جائے گا۔“
 اس کے بعد بوڑھا کشمیری میرے لئے کچھ کھانے کو لینے کے لئے چلا گیا۔ کھانا لے کر
 شیر علی اس کا بیٹا آیا۔ کہنے لگا۔
 ”بابا! گاؤں ایک کام سے گئے ہیں۔“

ایک لمحے کے لئے مجھے شک سا پڑا۔ شک پڑنا ہمارے لئے بڑا ضروری ہوتا ہے۔
 لیکن بوڑھے کشمیری کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آیا تو میں نے اپنے دل سے شک نکال
 کر باہر پھینک دیا۔ ہمیں کسی نہ کسی پر اعتبار بھی ضرور کرنا پڑتا ہے۔ شیر علی میرے
 سامنے بیٹھا رہا۔ میں نے تھوڑا بہت کھانا کھالیا اور اس سے پوچھا۔
 ”کیا تمہارے بابا نے تم سے خوبانیوں کے باغ کا ذکر کیا تھا؟“
 وہ بولا۔

”ہاں! بابا نے کہا تھا کہ تم اس باغ کی دوسری طرف پہاڑی ٹیلے کے پاس جو گاؤں
 ہے وہاں جانا چاہتے ہو۔ میں تمہیں اس گاؤں میں لے جاؤں گا۔“
 میں نے کہا۔

”نہیں نہیں۔ تم مجھے بس خوبانیوں کے باغ میں پہنچا دینا۔ اس کے بعد میں خود ہی
 گاؤں پہنچ جاؤں گا“

کشمیری میرے لئے کچھ کھانے کو اور سبز چائے لے آیا۔ کہنے لگا۔
 ”شیر علی کو میں نے سمجھا دیا ہے۔ وہ عشاء کی نماز کے بعد تمہیں لے کر یہاں سے
 روانہ ہو جائے گا۔“
 پھر وہ کہنے لگا۔

”بیٹا ہم غریب لوگ ہیں۔ تمہاری اچھی طرح سے خاطر تواضع نہیں کر سکے“
 میں نے کہا۔
 ”بیٹا! مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے وہ میں ساری زندگی
 نہیں بھلا سکوں گا۔“

عشاء کی نماز کے بعد شیر علی اور بوڑھا کشمیری دونوں میرے پاس پہاڑی کے غار میں
 آئے۔ میں پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ ہم غار میں سے نکل کر مکان کے عقب میں آئے تو
 بوڑھے کشمیری نے مجھے گلے لگا کر میرا ماتھا چوما اور کہا
 ”خدا تمہارا نگہبان ہو۔“

میں نے بوڑھے کشمیری سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور شیر علی کے پیچھے پیچھے مکان
 کے عقبی صحن کے خثیب میں اتر گیا۔ یہاں سے ایک گہری گھاٹی شروع ہو جاتی تھی۔ ہم
 گھاٹی میں اتر گئے۔ شیر علی آگے آگے چل رہا تھا۔ گھاٹی میں اندھیرا تھا مگر اس اندھیرے
 میں ہمیں جھاڑیاں اور بڑے بڑے پتھر نظر آرہے تھے۔ ہم گھاٹی کے اندر جھاڑیوں اور
 پتھروں کے درمیان راستہ بناتے۔ اندھیرے میں غور سے دیکھتے چلتے گئے۔ ہم کافی دور تک
 نکل گئے تھے۔ ایک جگہ گھاٹی بہت زیادہ خثیب میں اتر گئی تھی۔ شیر علی یہاں رک گیا۔
 اس نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ اور وہ ایک جگہ سے اوپر چڑھنے لگا۔ میں اس کے پیچھے
 تھا۔ ہم سرکندوں اور جھاڑیوں کو پکڑ کر اوپر چڑھ رہے تھے۔ آخر ہم گھاٹی سے باہر آ گئے۔
 سامنے دو پہاڑی ٹیلوں کے درمیان ایک راستہ نظر آرہا تھا۔ شیر علی اس راستے پر چلنے لگا۔
 ٹیلوں کی دوسری طرف درختوں کے کافی جھنڈ تھے۔ شیر علی نے کہا۔

”یہاں سے بائیں طرف بھارتی فوج کی ایک چوکی ہے۔ ہم اب کوئی بات نہیں کریں

میں نے اس سے بھارتی فوج کی چوکیوں کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا۔
 ”فوج کی یہاں صرف دو چوکیاں ہیں ایک یہاں سے نیچے خراس کے پاس ہے اور
 دوسری اوپر بائیں جانب پہاڑی ٹیلے پر ہے۔ میں سارا علاقہ پھر کر آیا ہوں۔ انڈین فوج
 میں نے درختوں اور ٹیلوں کے درمیان کئی جگہ گشت لگاتے دیکھے ہیں۔“
 میں نے اس سے پوچھا۔

”شیر علی! رات کو تم مجھے کس خفیہ راستے سے یہاں سے نکالو گے؟ کیا اس طرف
 فوجی گشت پر نہیں ہوں گے؟“
 وہ کہنے لگا۔

”ضرور ہوں گے۔ مگر مجھے ان کی فکر نہیں۔ کشمیر کی پہاڑیوں میں ایسے ایسے خفیہ
 راستے ہیں کہ بھارتی فوج کی پوری پلیٹن بھی آجائیں تو وہاں نہیں پہنچ سکتیں۔“
 میں نے اس سے پوچھا۔

”تمہارے خیال میں ہمیں رات کو کس وقت یہاں سے نکلنا چاہئے؟“

شیر علی نے کچھ توقف کیا۔ پھر بولا۔

”عشاء کی نماز کے بعد نکل چلیں گے“

وہ برتن لے کر جانے لگا تو میں نے کہا۔

”بابا کس وقت تک آجائیں گے؟“

وہ بولا۔

”تھوڑی دیر میں آجائیں گے تمہارے لئے کشمیری چائے لاؤں؟“

میں نے کہا۔

”نہیں۔ چائے کی ضرورت نہیں ہے“

وہ چلا گیا۔ میں رات کو وہاں سے نکلنے کے پلان کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے
 معلوم تھا کہ شیر علی مجھے کسی محفوظ راستے ہی سے یہاں سے باہر نکالے گا۔ وہ ٹھیک کہتا
 تھا۔ کشمیری دیہاتی پہاڑیوں کے تمام راستوں سے واقف ہوتے ہیں۔ شام ہو گئی تو بوڑھا

یہ آوازیں ہم سے چند قدموں کے فاصلے سے آگے نکل گئی تھیں۔ عورت مسلسل آہ و زاری اور منت ساجت کر رہی تھی۔ شیر علی نے میرے کان کے قریب ہو کر کہا۔
 ”یہ ڈوگرہ سپاہی ہیں۔ کسی کشمیری عورت کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔“
 میں جھاڑیوں میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے آگے درختوں کی طرف دیکھا جدھر سے عورت کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ مجھے اندھیرے میں دو فوجی ہیٹ والے آدمی نظر آئے جو ایک عورت کو کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے شیر علی کے کان میں کہا
 ”تم یہیں ٹھہرو“

اس کے ساتھ ہی میں اس چالاک چیتے کی مانند جس نے اپنے شکار کو دیکھ لیا ہو جست لگا کر جھاڑیوں کی دوسری جانب نکل گیا۔ میں ڈوگرہ فوجیوں سے پہلو بچاتا ہوا اوپر کے درختوں میں سے تیز تیز مگر جھک کر چلتا ان سے کوئی پچاس گز آگے نکل آیا۔ میں نے جھاڑیوں میں سے سر اٹھا کر دیکھا۔ دور سے دونوں ڈوگرہ فوجی عورت کو کھینچتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ انہیں جھاڑیوں کے درمیان اسی پگ ڈنڈی پر سے گزرنا تھا جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ میں بالکل نتنا تھا۔ مگر کمانڈو نتنا بھی ہو تو عام آدمی اور عام سپاہی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ میرے اندر ایک آتش فشاں پہاڑ کی طرح کھولتا ابلتا ہوا جوش اور جذبہ بھی تھا۔ کافر ڈوگرہ فوجی ایک معصوم مسلمان عورت کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میری موجودگی میں وہ زندہ بچ کر نکل جائیں۔

ڈوگرہ فوجیوں کے سائے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے اتنا دیکھ لیا تھا کہ ان کی شین گتیں ان کے کاندھوں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ میرے کمانڈو انہک کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ جب وہ اور قریب آگئے تو میں جھاڑیوں میں بیٹھ گیا۔ عورت سسکیاں بھرتے ہوئے ان کی منتیں کر رہی تھی۔ ایک ڈوگرے نے عورت کا ایک بازو اور دوسرے ڈوگرے سپاہی نے عورت کو دوسرے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ عورت کو تیز تیز چلا رہے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔ میں ڈوگرہ فوجیوں میں سے کسی ایک کو بھی اتنی

گے۔ ہو سکتا ہے کوئی گشتی پارٹی پھر رہی ہو۔“

ہم درختوں کے پیچھے سے ہو کر گزرنے لگے۔ ہم بڑی احتیاط سے چاروں طرف اندھیرے میں غور سے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ درختوں کے جھنڈو ختم ہوئے تو ہمیں ایک پہاڑی نالے میں سے گزرنا پڑا۔ یہاں نالے کا پانی ہمارے ٹخنوں سے بھی نچا تھا۔ نالے میں سے گزرنے کے بعد میں نے کچھ فاصلے پر اونچی پہاڑی کو دیکھا۔ شیر علی اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر بولا۔

”اس پہاڑی کے پاس خوبانیوں والا باغ ہے جہاں آپ کو جانا ہے۔“

ہم خود رو جھاڑیوں، چھوٹے بوے درختوں اور اونچی نیچی پگ ڈنڈیوں پر چلتے رہے۔ راستہ تھوڑی دور چلنے کے بعد کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف مڑ جاتا تھا۔ ہم ایک چھوٹی سی وادی میں داخل ہو گئے۔ اندھیرے میں نیچے کچھ کھیت اور درخت نظر آ رہے تھے۔ پگ ڈنڈی ایک ٹیلے کا موڑ کاٹ کر دوسری جانب درختوں کے ہموار قطعے میں نکل آئی۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا اور خاموشی تھی۔ یہ اندھیرا ایسا نہیں تھا کہ جیسا کمرے میں بجتی بجھ جائے تو ہوتا ہے۔ یہ پہاڑی علاقے کی رات کا اندھیرا تھا جس میں ہر شے کا سلیٹی رنگ کا ہیولا ضرور نظر آ جاتا تھا۔ آسمان کبھی نظر آتا اور کبھی اوپر پھیلی ہوئی درختوں کی شاخوں کی اوٹ میں ہو جاتا۔ اچانک ہمیں ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی جھاڑیوں میں چل رہا ہو۔ شیر علی نے اشارہ کیا اور ہم دونوں چلتے چلتے وہیں بیٹھ گئے۔ آواز تھوڑے فاصلے سے آرہی تھی۔ پھر کسی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ عورت نے کشمیری زبان میں روتے ہوئے کہا۔

”خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔ میری شادی ہونے والی ہے۔“

شیر علی نے اندھیرے میں میری طرف اور میں نے شیر علی کی طرف دیکھا۔ ایک سیکنڈ میں ہم معاملے کی نوعیت کو سمجھ گئے تھے۔ اتنے میں کسی نے عورت کو گالی دے کر ڈوگرہ لہجے میں کہا۔

”پہلے ہم دونوں تم سے شادی کریں گے“

مہلت نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ کندھے سے شین گن اتار کر مجھ پر فائر کر سکتا۔ بس میری سب سے اہم حکمت عملی تھی۔ دونوں فوجی کشمیری عورت کو کھینچتے ہوئے ا جھاڑی کے قریب سے گزر رہے تھے جس کے اند میں چپتے کی طرح گھات لگائے بیٹھا تھے جیسے ہی وہ میرے سامنے سے ایک قدم آگے ہوئے میں نے ان میں سے ایک فوجی پر حملہ کر دیا۔ میرا حملہ کسی نا تجربہ کار جذباتی آدمی کا حملہ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے ایک ہی ضرب سے دشمن کو موت کی نیند سلانا ہو گا۔ اور اس کے ساتھ ہی بجلی ایسی تیزی سے دوسرے فوجی پر اٹیک کرنا ہو گا۔

میں نے جھاڑیوں میں سے نکلتے ہی اپنی طرف والے ڈوگرہ فوجی کی گردن میں بازو ڈالا اور اسے پوری طاقت سے جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ میں نے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز سن لی تھی۔ یہ ایک خاص آواز ہوتی ہے جس سے ہم کمانڈوز کے کان بخوبی آتے ہیں۔ اس آواز کے بعد دشمن کا زندہ رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ پہلے ڈوگرہ فوجی کو چھوڑنے کے ساتھ ہی میں نے دوسرے فوجی کو دبوچ لیا جو اپنے ساتھی پر حملہ ہوتے دیکھ کر اپنی شین گن سیدھی کر رہا تھا۔ میں نے اسے شین گن کا ٹریگر دبانے کی مہلت نہ دی اور نیچے سے ہاتھ مار کر اس کی شین گن کو اوپر کو اچھالا اور دوسرے بازو سے اس کی گردن کو نیچے کر کے اپنی گھٹنوں کو زور سے اوپر اٹھا کر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ڈوگرہ سپاہی بوکھلا کر نیچے گرا۔ مگر وہ ابھی زندہ تھا۔ میں فوراً اس پر گرا اور اس کی گردن دبوچ لی۔ دوسرے لمحے میرے ایک جھٹکے کے بعد وہ بھی مر چکا تھا۔

اس دوران کشمیری عورت سہم کر بیٹھ گئی تھی اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے اس خونیں ڈرامے کو دیکھ رہی تھی۔ جب میں دوسرے ڈوگرہ فوجی کو ٹھکانے لگا رہا تھا تو کشمیری عورت اٹھ کر بھاگنے لگی۔ میں نے اسے شکستہ کشمیری زبان میں کہا۔

”بہن! بھاگو نہیں۔ میں مجاہد ہوں“

وہ وہیں رک گئی۔ دونوں ڈوگرہ فوجیوں کی لاشیں اندھیرے میں زمین پر جھاڑیوں کے پاس پڑی تھیں۔ اب مجھے ان لاشوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ میں انہیں اسی طرح وہاں

نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے عورت کا دوپٹہ اس کے سر پر دیا اور آہستہ سے کہا۔

”میرا ایک کشمیری مجاہد ساتھی پیچھے ہے میرے ساتھ آؤ۔ وہ تمہیں تمہارے گھر پہنچا دے گا۔“

عورت نے میرا بازو تھام لیا۔ وہ خدا اور رسول ﷺ پاک کا نام لے کر مجھے دعائیں دے رہی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

”خاموش رہو“

وہ چپ ہو گئی۔ میں اسے لے کر وہاں آگیا جہاں شیر علی چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ساتھ کشمیری عورت کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے کہا۔

”شیر علی! میں اس عورت کو ڈوگرہ فوجیوں سے بچا کر لے آیا ہوں“

شیر علی نے فرط مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”دونوں ڈوگرے کہاں ہیں؟“

میں نے کہا۔

”ان کی لاشیں جھاڑیوں کے پاس پڑی ہیں۔ ہمیں انہیں کسی ایسی جگہ پھینکنا ہو گا جہاں سے ان کی لاشیں کسی کو نہ مل سکیں۔ کیا آگے کوئی کھڈیا کھائی ہے؟“

شیر علی بولا۔

”ضرور ہوگی۔ آؤ وہاں چلتے ہیں“

اس نے کشمیری عورت کو تسلی دی اور اپنی زبان میں سمجھایا کہ ہم کشمیری کمانڈو ہیں۔ اس طرف سے گزر رہے تھے کہ تمہاری آواز سن کر تمہاری مدد کے لئے رک گئے۔ کشمیری عورت کا چہرہ مجھے اندھیرے میں مسکراتا ہوا نظر آیا۔ وہ ہمیں دعائیں دینے لگی۔ میں نے اسے کہا۔

”بہن! تم بھی ہمارے ساتھ آؤ۔“

شیر علی نے اس سے پوچھا۔

”تمہارا گاؤں کہاں ہے؟“

”جناب! کیا آپ مجھے بھی کمانڈو بنا کر اپنے ساتھ شامل نہیں کر سکتے؟ میں بھی کشمیر کے جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے راتیں چلائی آتی ہے“

میں نے کہا۔

”شیر علی! تمہارا یہ جذبہ قابل قدر ہے مگر تمہیں میرے ساتھ جانے کی بجائے اپنے علاقے کے مجاہدین سے رابطہ پیدا کرنا چاہئے۔ وہ تمہیں کمانڈو کی ٹریننگ بھی دیں گے۔“

شیر علی مجھے السلام علیکم کہہ کر جس طرف سے مجھے لے کر آیا تھا اس طرف چل دیا۔ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ جب شیر علی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو میں اٹھا اور نیچے جھاڑیوں میں سے گزر کر سامنے والے ٹیلے کی طرف چلنے لگا۔ جیسے جیسے میں آگے جا رہا تھا مجھے راستے کی ساری نشانیاں ملتی جا رہی تھیں۔ آخر میں ایک گھائی کو پار کر کے ٹیلے کے درختوں میں پہنچ گیا۔ کمانڈو شیروان کا ہائیڈ آؤٹ یہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔ کمانڈو شیروان نے بڑی گرجوشتی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور مجھے مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

”ہم نے پہاڑی کے گیرزن کو اڑا کر بھارتی فوج سے بدلہ لے لیا ہے۔“

میں نے کمانڈو اورنگ زیب کا پوچھا تو وہ بولا۔

”اورنگ زیب پہنچ گیا تھا۔ ہمیں تمہاری بہت فکر تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بھی زندہ سلامت واپس آگئے۔ اورنگ زیب سو رہا ہے۔ تم بھی آرام کرو۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔“

کمانڈو شیروان نے میرے کندھے پر شین گن دیکھی تو اس نے پوچھا۔

”یہ شین گن تو کسی ڈوگرہ سپاہی کی ہے؟“

پھر میں نے اسے کشمیری عورت اور دونوں ڈوگرہ فوجیوں کو ٹھکانے لگانے کا سارا واقعہ سنا دیا۔ کمانڈو شیروان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے میرے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور بولا۔

”تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ تمہیں بھوک تو نہیں لگی؟“

میں نے کہا۔

”بوڑھے کشمیری نے مجھے رات کو بہت کچھ کھلا پلا کر روانہ کیا تھا“

کمانڈو شیروان نے پر عزم لہجے میں کہا۔

”انشاء اللہ! وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب کشمیر میں ہماری آزادی اور خود

بٹاری کا سورج طلوع ہو گا۔“

میں اپنے چھوٹے سے کنزی کے کموکے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس قدر تھک گیا تھا کہ لپٹتی ہی نیند آ گئی۔

دوسرے روز دن چڑھے اورنگ زیب کمانڈو سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے بھی اپنے رُفقاء اور پھر نالے میں چھلانگ لگا کر فرار ہونے اور شیر علی کے ساتھ کشمیری عورت کو بحفاظت اس کے ماں باپ کے پاس پہنچانے اور ڈوگرہ سپاہیوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کی کارگزاری سنادی۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

”میں تو کسی طرح وہاں سے نکل آیا تھا مگر مجھے تمہاری فکر تھی۔ ہم سب اس بات پر پریشان تھے کہ ہمارے ٹائم بم وقت پر نہیں پھٹے تھے۔ ہمیں ان بموں کے ٹائم ڈیوائس پھر سے چیک کرنے پڑیں گے۔ کمانڈر شیروان نے اپنے دو آدمیوں کی ان کی چیکنگ کی ڈیوٹی لگادی ہے۔“

میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے پوچھا۔

”اس دھماکے کے بعد تو بھارتی فوجیوں نے شہر میں اپنی ظالمانہ کارروائیاں تیز کر دی

ہوں گی۔“

وہ بولا۔

”کمانڈر شیروان کے پاس ساری رپورٹیں پہنچ چکی ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بھارتی فوج نے مجاہدین کے ایک ٹھکانے پر حملہ بھی کیا ہے مگر خوش قسمتی سے اس وقت وہاں کوئی مجاہد نہیں تھا۔ ویسے فوج نے کئی لوگوں کو گرفتار کیا ہے۔“

چلو کمانڈر شیروان کے پاس چلتے ہیں وہ تمہارے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا“

ہم دونوں غار کے اندر کمانڈو شیروان کے خفیہ ہیڈ کوارٹر میں آگئے۔ کمانڈو شیروان گیس کی روشنی میں میز پر بچے ہوئے نقشے کو جھک کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر پر سبز رد مال بندھا ہوا تھا۔ ہمیں آتا دیکھ کر اس نے کہا۔

”پہاڑی گیریزن کی تباہی پر بھارتی فوج میں زبردست اضطراب پھیلا ہوا ہے۔ فوج بوکھلا کر اندھا دھند پکڑ دھکڑ کر رہی ہے۔ فوجی ہائی کمانڈ کی یہ سب سے بڑی شکست ہے۔“

میں اور کمانڈو اورنگ زیب میز کے پاس سٹولوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا۔

”اس آپریشن میں کتنے بھارتی سپاہی مرے ہوں گے؟“

کمانڈو شیروان نے کہا۔

”ہم تک جو خبریں پہنچی ہیں ان کے مطابق انفنٹری رجمنٹ کے کم از کم ڈیڑھ ہزار فوجی اس وقت پہاڑی والے گیریزن میں موجود تھے اور ظاہر ہے اتنی بڑی تباہی کے بعد ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا ہو گا۔“

کمانڈو اورنگ زیب بولا۔

”سرا مجھے لگتا ہے بھارتی فوج اس کے جواب میں کوئی زبردست جوابی کارروائی کرے گی۔“

کمانڈو شیروان نے کہا۔

”ہمارے کشمیری مجاہد غافل نہیں ہیں۔ وہ ان کی ہر جوابی کارروائی کا اسی شدت سے مقابلہ کریں گے۔ ہم بھی تیار بیٹھے ہیں۔ اصل میں انڈیا کی حکومت اپنی فوج کشمیر میں بھیج کر سخت پریشان ہے۔ اس نے فوج کے ذریعے آزادی کشمیر کی تحریک کو دبا کر کشمیریوں کے حق خود اختیاری کو پکھل کر کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہا تھا جس میں وہ پوری طرح ناکام ہو چکی ہے۔ اگر ہمارے مجاہد شہید ہو رہے ہیں تو بھارتی فوجی بھی ہلاک ہو رہے ہیں۔ بلکہ بھارتی فوجیوں کی ہلاکت کی رفتار زیادہ تیز ہے۔“

ہم باتیں کر رہے تھے کمانڈو شیروان کا خاص باڈی گارڈ اندر آیا۔ اس نے ایڑیاں جوڑ

کر سیٹھ کیا اور کہا۔

”کمانڈو بابر علی شہر سے کوئی خاص خبر لے کر آیا ہے۔“

کمانڈو شیروان نے کہا۔

”اسے فوراً اندر بھیج دو“

وہاں خاموشی چھا گئی۔ اورنگ زیب نے آہستہ سے کہا۔

”مجھے خبر کی خبر نہیں لگتی“

مجاہد بابر علی نے اندر آکر کمانڈو شیروان کو سلام کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ شیروان نے کہا۔

”کیا خبر لائے ہو؟“

بابر علی نے کہا۔

”کمانڈو! ابھی تھوڑی دیر پہلے بھارتی فوجیوں کے ایک دستے نے سری نگر کے شمالی محلے میں آکر پندرہ مکانوں کو آگ لگا دی اور تحریک حریت کے بزرگ کارکن اور محلے کی جامع مسجد کے امام حاجی ثناء اللہ ڈار کی نوجوان بیٹی پروین ڈار کو اٹھا کر لے گئی ہے۔“

کمانڈو شیروان کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ سٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک لمحے کے لئے گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ کمانڈو شیروان نے پوچھا۔

”فوج پروین ڈار کو کہاں لے گئی ہے؟“

بابر علی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کچھ معلوم نہیں۔ یعنی شاہدوں کا بیان ہے کہ انہوں نے لڑکی کو اٹھا کر جپ میں ڈالا اور کسی نامعلوم مقام کی طرف لے گئے۔ پروین کی ماں اور چھوٹی بہن کو زود کو ب بھی کیا۔ اس وقت گھر پر پروین کا والد حاجی صاحب موجود نہیں تھے۔“

شیروان سٹول پر بیٹھ گیا۔ غصے میں اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے میز پر زور سے ٹکارتے ہوئے کہا۔

”ہم اس بزدلانہ کارروائی کا بدلہ لیں گے لیکن ہمیں سب سے پہلے حاجی صاحب کی

ہوں گے جنہوں نے بھارتی فوج کے خیال کے مطابق پہاڑی والی فوجی چھاؤنی کو اڑایا تھا۔“
سارا دن انتہائی بد مزگی میں گزرا۔ اس دوران کمانڈو شیروان نے اپنے ایک خاص آدمی کو حاجی ٹاٹا اللہ ڈار کے گھر یہ پیغام دے کر بھیج دیا کہ بھارتی درجنوں نے ان کی بیٹی کو نہیں ہماری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ ہم ایک ایک کر کے اپنی جانیں قربان کر دیں گے اور بیٹی پروین کو ظالم بھارتی فوج کی قید سے ضرور رہا کرائیں گے۔

ابھی شام کا اندھیرا پوری طرح سے نہیں چھایا تھا کہ مجاہد باہر علی آگیا۔ ہم لوگ عار کے اندر خاص تمہ خانے میں آگئے۔
”کیا معلومات لائے ہو؟“

کمانڈو شیروان نے پوچھا۔ باہر علی نے کہا۔

”کمانڈر! ایریا کمانڈر کرنل بھگت رام نے حاجی صاحب کو پیغام بھجوایا ہے کہ ہم نہیں دودن کی مہلت دیتے ہیں۔ اگر دودن کے اندر اندر ہمیں ان کشمیریوں کے نام اور ٹھکانوں کا پتہ نہ بتایا گیا جنہوں نے انڈین انفنٹری کی چودھویں رجمنٹ کی چھاؤنی کو تباہ کیا ہے تو تمہاری بیٹی کا سر کاٹ کر تمہارے گھر روانہ کر دیا جائے گا۔“

باہر علی چپ ہو گیا۔ شیروان نے کہا۔

”آگے کو“

باہر علی بولا۔

”ہم نے اپنے آدمیوں کو خبردار کر دیا ہے۔ ان میں ہمارے وہ آدمی بھی شامل ہیں جو فوج کے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں چھوٹے چھوٹے مختلف کام کرتے ہیں“

”اس کا مطلب ہے ابھی تک تمہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ پروین ڈار کس جگہ پر قید ہے“

کمانڈو شیروان کے اس استفسار پر باہر علی بولا۔

”سرا صبح تک اس کا بھی سراغ مل جائے گا۔“

کمانڈو شیروان نے باہر علی کا شکریہ ادا کیا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے

بیٹی پروین کو انڈین فوج کے قبضے سے چھڑانا ہو گا۔ ہم اس ظلم کو برداشت نہیں کر سکتے۔“
پھر اس نے باہر علی کی طرف دیکھا اور کہا۔

”باہر علی! یہ تمہاری ڈیوٹی ہے کہ شام ہونے سے پہلے پہلے حاجی صاحب کی بیٹی کا پتہ لگاؤ کہ فوج نے اسے کہاں رکھا ہے اور اس کے ہاتھ کوئی ناروا سلوک تو نہیں کیا گیا۔ ابھی جاؤ“

باہر علی نے سینے پر زور سے ہاتھ مار کر سلام کیا اور واپس چلا گیا۔ کمانڈو شیروان کے علاوہ ہم دونوں پر بھی ہیجان کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے کہا۔

”ہم اس کے جواب میں ایریا کمانڈر کی بیٹی یا بیوی کو اغوا کریں گے“

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”ہم بھارتی ایریا کمانڈر سمیت اس کے سارے خاندان کو ہلاک کریں گے“

شیروان کی اضطرابی کیفیت آہستہ آہستہ دور ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”سب کچھ بعد میں ہو گا۔ سب سے پہلے ہمیں پروین کو درندہ صفت بھارتی فوجیوں کے چنگل سے نکال کر لانا ہو گا۔ پروین ایک مقامی کالج میں پروفیسر ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی سنجیدہ مزاج محب الوطن لڑکی ہے۔ میں اس فیملی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ حاجی صاحب اگلے سال بیٹی کی شادی کرنے والے تھے۔ یہ حادثہ نہ صرف پروین بلکہ اس کے سارے خاندان کو برباد کر سکتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”اس علاقے میں انڈین ملٹری کمانڈ ہیڈ کوارٹر کس جگہ پر ہے؟“

شیروان نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”ان کا ڈویژنل کمانڈ آفس سری نگر کے شمال میں ہے۔ مگر سب سے پہلے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ حاجی صاحب کی بیٹی کو فوج نے کہاں رکھا ہوا ہے۔ یقیناً فوج نے اسے یرغمال بنایا ہو گا اور وہ اس کے بدلے حاجی صاحب سے ان مجاہدوں کا نام پوچھنا چاہتے

عمل میں مرد مجاہد کی طرح کود پڑتے تھے۔ اور یہاں یہ حالت تھی کہ کل دوپہر سے ہم بے عملی کی حالت میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے اور سوائے غور و فکر کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

بابر علی آیا تو کمانڈو شیروان نے فوراً پوچھا۔

”کیا پتہ چلا پروین کا؟“

مجاہد بابر علی نے کہا۔

”کمانڈو ہمارے آدمی پوری سراغ رسانی کرنے کے بعد جو خبر لائے ہیں وہ یہ ہے کہ پروین کو فوج راتوں رات وادی کشمیر سے نکال کر بذریعہ ہیلی کاپٹر جموں لے گئی جنوں سے اسے اسی رات دوسرے فوجی ہیلی کاپٹر کے ذریعے شملے پہنچا دیا گیا ہے۔ اس وقت پروین شملے کے آٹھویں جاٹ رجمنٹ کے فوجی گیریزن میں قید ہے۔“

یہ خبر میرے لئے اس واسطے حیران کن نہیں تھی کہ بھارتی فوج کا کمانڈر کرنل بھگت رام پروین کو بطور مہرے کے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ سری نگر گیریزن کی عبرت ناک تباہی اور سینکڑوں بھارتی فوجیوں کی ہلاکت کے باعث کرنل بھگت رام کا پورا کیریئر خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس کا کورٹ مارشل بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن خدا جانے کس وجہ سے وہ اپنی پوسٹ پر قائم رہا۔ لیکن اس نے تحریک آزادی کے سرگرم بزرگ کارکن اور سری نگر کی باعزت شخصیت حاجی ثناء اللہ کی صاحبزادی کو اغوا کر کے یرغمال بنایا اور اب اس کے بدلے وہ حاجی صاحب سے گیریزن اڑانے والے کشمیری مجاہدوں یا کمانڈوز کے نام اور ٹھکانے معلوم کر کے انڈین فوجی ہائی کمانڈ کے آگے اشک شوئی کرنا چاہتا تھا۔ اس حقیقت سے ہم سب پوری طرح باخبر تھے۔

بابر علی کا بیان سننے کے بعد کمانڈو شیروان نے اورنگ زیب کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”کرنل بھگت رام نے حاجی صاحب کو تین دن کی مہلت دی ہے۔ ظاہر ہے حاجی صاحب اسے اپنے کسی مجاہد کا نام اور ٹھکانہ نہیں بتائیں گے۔ اور پھر یہ کام کشمیری

لئے کہا۔ مجاہد بابر علی سینے پر ہاتھ رکھ کر سلام کر کے تمہ خانے سے باہر نکل گیا۔

شیروان بے چین تھا۔ ہم بھی پریشان تھے۔ شیروان پندرہ فٹ چوڑے اور اتنے ہی لمبے غار کے تمہ خانے اور اپنے ہیڈ کوارٹر میں بے قراری سے شملے لگا۔ وہ بار بار اپنی مٹھیاں بھیجنے لیتا۔ کمانڈو اورنگ زیب بولا۔

”سرا ہمیں خود فوجی ایریا کمانڈ میں جا کر پروین کا سراغ لگانا چاہئے۔“

شیروان شمول پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

”نہیں اورنگ زیب۔ ہم جذبات میں آکر کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ ہم سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھائیں گے۔ ہمارے آدمی کل تک پروین کا پتہ لگالیں گے۔ اس کے بعد کوئی پلان بنایا جائے گا۔ ایریا کمانڈو پوسٹ پر جا کر محض کمانڈو انٹیک کرنے اور پندرہ بیس بھارتی فوجیوں کو ہلاک کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ بلکہ اس سے صورت حال مزید بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔“

وہ رات ہم نے بے چینی کی حالت میں گزاری آدمی رات تک میں کمانڈو شیروان اور کمانڈو اورنگ زیب تمہ خانے میں بیٹھے مختلف سیکموں پر غور کرتے رہے۔ آدمی رات کے بعد ہم بادل خواستہ سونے کے لئے اٹھ کر اپنی اپنی جگہوں پر چلے گئے۔

دوسرے روز فجر کی نماز ہم تینوں نے اکٹھے پڑھی۔ ہم میں سے ہر کوئی خاموش تھا۔ رات کو ہی ہمیں یہ خبر بھی مل گئی تھی کہ سری نگر شہر میں مسلمان کشمیری حاجی صاحب کی بیٹی کے اغواء کے خلاف گھروں سے باہر نکل آئے ہیں اور ان کا کئی جگہوں پر فوج اور پولیس سے ٹکراؤ بھی ہوا ہے اور کئی جوان فوج کی فائرنگ سے زخمی ہوئے ہیں۔ شہر میں جگہ جگہ ڈوگرہ فوج گشت لگا رہی تھی۔

دوپہر بھی گزر گئی۔ دن کے تین بجے کے قریب بابر علی واپس آگیا۔ اس وقت بھی ہم اپنے تمہ خانے میں بیٹھے غور و فکر کر رہے تھے۔ ہم زیادہ غور و فکر کرنے والے لوگ نہیں تھے۔ ہم عمل کرنے والے مجاہد تھے۔ ہم کمانڈو تھے۔ ہمارا کام ایکشن تھا۔ ہم صرف ایکشن سے تھوڑی دیر کے لئے اپنے پلان کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے اور پھر میدان

میں لگے رہتے تھے اور بڑی اہم معلومات مہیا کرتے رہتے تھے۔ یہ کوئی کمائدو نہیں تھے۔ یہ عام محب وطن کشمیری تھے۔ ان میں نوجوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ وہ جب پکڑے جاتے تھے تو اپنے منہ بند کر لیتے تھے۔ بھارتی فوجی ان پر اس قدر تشدد کرتے کہ ان کے پیٹ پھاڑ دیئے جاتے۔ ان کی آنکھیں نکال دی جاتیں۔ وہ اسی حالت میں شہید ہو جاتے مگر اپنے کسی ساتھی کا نام زبان پر نہیں لاتے تھے۔ یہ بڑے بہادر اور آزادی کشمیر کے نام پر اپنے وطن کی آزادی کے نام پر جان نچھاور کر دینے والے نڈر مسلمان کشمیری تھے۔ ان کو کسی نہ کوئی ٹریننگ نہیں دی تھی۔ انہوں نے سگنل کور کا کوئی کورس پاس نہیں کیا تھا۔ ان کے دل میں جہاد کا بے پناہ جذبہ تھا۔ اسلام اور کشمیر کی آزادی کی خاطر جان قربان کر دینے کا ناقابل شکست جذبہ تھا۔ اسی جذبے نے انہیں سب کچھ سکھا دیا تھا۔ یہ گم نام کشمیری مجاہد تھے جو اپنے گھروں سے اپنے ماں باپ اور بچوں سے دور بیٹھے اپنے وطن کی خاطر اپنی جان کے نذرانے پیش کر رہے تھے اور آزادی کشمیر کی خاطر کام کر رہے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ کمائدو شیروان کو مجاہد بابر علی کی حاصل کردہ رپورٹوں پر پورا یقین تھا۔ اس نے بابر علی کو واپس بھیج دیا۔ اب ہمارے سامنے ایک راستہ متعین ہو گیا تھا۔ ہم اس پر غور کرنے لگے۔

کمائدو شیروان نے کہا۔

”تم دونوں کو آج ہی یہاں سے شملے کی طرف نکل جانا ہو گا۔“

اس نے اورنگ زیب کی طرف چہرہ اٹھا کر کہا۔

”اورنگ زیب! تم شملے کئی بار جا چکے ہو۔ تم اس شہر سے اچھی طرح واقف ہو اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارا ایک خاص آدمی وہاں موجود ہے۔ وہ اس سلسلے میں تمہاری مدد کرے گا۔ تم دونوں کو میرے خفیہ سگنل کوڈ کا علم ہے۔ تم وائرلیس ٹرانسمیٹر پر مجھ سے رابطہ قائم رکھو گے۔ شملے میں ہمارے خاص آدمی کے پاس وائرلیس سیٹ موجود ہے۔ اگر یہاں کرنل بھگت رام نے پروین کی مہلت کی مدت میں اضافہ کیا تو ہم تمہیں وائرلیس پر خبر کر دیں گے۔ کوئی سوال؟“

مجاہدوں نے نہیں۔ ہم نے کیا تھا۔ ایسی صورت حال میں تین دن گزر جائیں گے اور بھارتی فوج کی شرط پوری نہیں ہوگی۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا کرنل بھگت رام تین دن کے بعد پروین کو قتل کر کے اس کا سر جیسا کہ اس نے خبردار کیا ہے حاجی صاحب کے پاس بھجوا دے گا؟“

کمائدو اورنگ زیب کہنے لگا۔

”میرا نہیں خیال وہ ایسا کرے گا۔ اس کے پاس پروین ڈار کی شکل میں ایک ترب کا پتا ہے۔ وہ اس کو زندہ رکھ کر اور یہ غالی بنا کر زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ خاص کر کے ایسی حالت میں جب کہ کرنل بھگت رام کے فوجی کیمپ کے تباہ ہونے کا خطرہ ہے۔ میرے خیال میں وہ حاجی صاحب کو مزید مہلت دے گا۔ مہلت میں اضافہ کر دے گا۔“

کمائدو شیروان نے مجھ سے رائے طلب کی تو میں نے کہا۔

”کمائدو! تم جو فیصلہ کرو گے میں اس پر جان کی بازی لگا کر عمل کروں گا۔“

شیروان نے بابر علی سے پوچھا۔

”بابر علی! میرے بھائی! مجھے یقین ہے کہ تمہارے آدمیوں کی رپورٹ معتبر ہوگی۔“

بابر علی نے جواب میں کہا۔

”سرا! پروین کے جموں اور جموں سے شملہ لے جانے کی رپورٹ میرے ایک ایسے

خاص آدمی نے دی ہے جس نے جموں سے خود پروین کو ایک کیپٹن اور دو بھارتی فوجیوں کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں ٹیک آف کرتے دیکھا ہے۔ اس کے بعد میرے اس آدمی نے اپنے خفیہ وائرلیس کی مدد سے جموں کے اپنے ساتھی سے بھی اس کی تصدیق کر لی ہے۔ جموں ایئر پورٹ پر پروین کو ایک بڑے فوجی ہیلی کاپٹر میں سوار کرا کر شملے کی طرف جایا گیا ہے جہاں اسے جٹ رجمنٹ کے فوجی گیریزن میں رکھا جائے گا۔“

ان لوگوں کی خبریں بالکل صحیح ہوتی تھیں۔ مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ ان کے آدے جگہ فوجی رہمٹوں پوسٹوں وغیرہ میں معمولی کاریگروں کی حیثیت سے اپنے اپنے

ہندی زبان بول بھی لیتا تھا اور پڑھ بھی لیتا تھا۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ میں نے سنسکرت زبان بھی تھوڑی سیکھ لی تھی۔ سنسکرت بڑی مشکل زبان ہے۔ میں اسے نہ لکھ سکتا تھا نہ پوری روانی سے پڑھ سکتا تھا۔ سمجھ ضرور لیتا تھا۔ سنسکرت میں بول بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس زبان کا سمجھ لینا ہی میرے لئے کافی مفید ثابت ہوا تھا اور ہو سکتا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب کشمیر جموں اور ہماچل پردیش کے سارے علاقے سے واقف تھا۔ شملے میں جو ہماچل پردیش کی حکومت کا صدر مقام تھا کافی عرصہ رہ چکا تھا۔ شملے کے بازاروں اور محلوں سے وہ اچھی طرح واقف تھا میں آپ کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ ہم کس علاقے سے گزر کر سری نگر سے بیس میل اوپر بانہال روڈ پر پہنچے وہاں سے ہم نے ایک بس پکڑی اور جموں شہر میں آگئے، جموں سے بس پکڑی اور جالندھر پہنچ گئے۔ یہ سارا سفر ہم نے ایک دوسرے سے الگ مگر ایک دوسرے کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے طے کیا۔ جالندھر سے ہمیں اسی روز انبالے جانے والی لاری مل گئی۔ انبالے سے ہم کالکا اور سولن سے ہوتے ہوئے چھوٹی لائن کی ٹرین میں سفر کرتے ہوئے شملے پہنچ گئے۔ شملے میں کافی سردی تھی۔ ابھی برفباری کا موسم شروع نہیں ہوا تھا مگر سرد ہوا آئیں چلنے لگی تھیں اور درختوں کے پتے گر رہے تھے۔ شملہ شہر کی مقامی آبادی بہت ہے۔ باہر سے آئے ہوئے لوگ نیچے میدانی شہروں کی طرف جا چکے تھے۔ پھر شملے کی سڑکوں پر کافی چل پھل تھی۔ مال روڈ کی دکانوں پر کافی رونق تھی۔ شملے کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد میں اور اورنگ زیب اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں شملہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب نے چڑے کی جیکٹ کا زپ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”تم یہاں اس طرح چلو گے جیسے یہ جگہ تمہارے لئے نئی نہیں ہے۔ یہاں خفیہ پولیس کے آدمی ہر طرف موجود رہتے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہیں ہونا چاہئے کہ تم شہر میں اجنبی ہو۔“

کمانڈو اورنگ زیب کی ہدایت کے مطابق میں اس سے ہنس کر باتیں کرتا ہوا چل رہا تھا۔ اپنے رویے اور چال ڈھال سے میں یہی تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم

ہم نے بیک زبان ہو کر کہا۔
”کوئی سوال نہیں سزا“

”اوکے۔ تم کو پندرہ منٹ ضروری تیاریوں کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد تم دونوں یہاں سے اپنے مشن پر نکل جاؤ گے۔ خدا حافظ!“

میں نے اور کمانڈو اورنگ زیب نے شیروان سے مصافحہ کیا۔ اس نے ہمیں خدا حافظ کہا اور ہم نے دونوں تمہ خانے سے باہر نکل آئے۔ ہمارے پاس صرف پندرہ منٹ تھے۔ ایک کمانڈو کو ہی وقت کی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمیں پندرہ منٹ کے اندر اندر سر تیاریاں کرنی تھیں۔ کمانڈو اورنگ زیب نے حاجی ثناء اللہ ڈار کی صاحبزادی کی شکل دیکھ ہوئی تھی۔ مجھے اس کی تصویر دکھا دی گئی۔ یہاں میں یہ وضاحت کر دینا ضروری سمجھا ہوں کہ میں نے حاجی صاحب کا نام بھی اپنی طرف سے فرضی لکھا ہے۔ ان کی بیٹی کا نام بھی کچھ اور تھا۔ چونکہ وہ لوگ زندہ ہیں اور کشمیر کی آزادی کی جنگ اپنے اپنے محاذوں پر پورے جذبے اور جوش سے لڑ رہے ہیں اس لئے ان کے صحیح نام اور کوائف لکھنا کی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ کمانڈو شیروان نے شملے میں خفیہ کام کرنے والے کشمیری مجاہد کا جو اصلی نام بتایا تھا وہ کچھ اور تھا۔ میں آپ کو اس کا فرضی نام بتاؤں گا۔ یہ فرضی نام شمس الدین ہو گا اور شملے کے جس بازار میں اس کی دکان تھی۔ اس بازار کا نام بھی نہیں لکھوں گا اور اصل میں وہ جو کاروبار کرتا ہے وہ بھی نہیں لکھوں گا۔

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد میں اور کمانڈو اورنگ زیب اپنے ہائیڈ آؤٹ سے نکل کر ایک خاص سمت کو پہاڑیوں کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ ہمارے لباس عام شہریوں والے تھے۔ ہمارے پاس کوئی سفری تھیلے وغیرہ بھی نہیں تھے۔ ہم ایسے جا رہے تھے جیسے یونیورسٹی کے لڑکے ہوں۔ کمانڈو اسی طرح سفر پر نکلا کرتے ہیں۔ اورنگ زیب کشمیر رہنے والا خوش شکل غیور نوجوان تھا۔ اسے انگریزی اور کشمیری کے علاوہ اردو زبان بھی عبور حاصل تھا۔ وہ ہماچل پردیش میں بولی جانے والی ڈوگری زبان بھی بڑی مہارت سے بول لیتا تھا۔ میں انگریزی، گجراتی اور تھوڑی تھوڑی کشمیری زبان بھی سیکھ گیا تھا۔

اسی پہاڑی سٹیشن کے رہنے والے ہیں۔ ہم نے گرم ادنی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ گرم جیکٹوں کے زپ چڑھائے ہوئے تھے۔ میری طرح کمانڈو اورنگ زیب بھی کبھی کبھار ہر سگریٹ پیتا تھا مگر شملے کی مال روڈ پر سے گزرتے ہوئے ہم نے سگریٹ سلگا رکھے تھے اور بڑی بے تکلفی سے چل رہے تھے۔

کوئی آدمی سامنے سے آکر یا پیچھے سے آکر ہمارے قریب سے گزرتا تو ہم وہاں کی مقامی ڈوگری زبان میں بولنے لگتے۔

جب ہم شملے کے بڑے پوسٹ آفس کی پرانی انگریزوں کے زمانے کی شاندار عمارت کے پاس پہنچے تو کمانڈو اورنگ زیب نے آہستہ سے کہا۔
”سامنے جو چھوٹی سڑکیں اوپر پہاڑی کی طرف جاتی ہیں ہم ان میں سے بائیں طرف والی سڑک پر جائیں گے۔“

ہم بالکل ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سامنے دو راستے آگئے۔ یہ دو چھوٹی پتہ سڑکیں تھیں۔ ہم بائیں طرف والی سڑک پر ہو گئے۔ تھوڑی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد آگے ایک خوبصورت سرسبز گراؤنڈ آگئی جس کے جنگل کے ساتھ درختوں کی قطار دو تک چلی گئی تھی۔ ایک طرف چھوٹا سا خوبصورت گرجا تھا۔ گرجے کے بڑے گیٹ کے سامنے پارک تھا۔ پارک میں بیچ بچے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب بولا۔

”ہم تھوڑی دیر یہاں رکیں گے۔“

اور ہم ایک بیچ پر بیٹھ گئے۔

اس وقت سورج شملہ کی پہاڑیوں میں غروب ہو رہا تھا۔
شملے کی پہاڑیوں کے نشیبی مکانوں اور شہر کی عمارتوں پر شام کے سرمئی سائے اترنا شروع ہو گئے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی مگر ہم اپنی جیکٹوں میں خوب گرم ہو کر بیٹھے تھے۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے بالکل نہ پوچھا کہ ہم یہاں کتنی دیر تک بیٹھیں گے۔ وہ اس وقت میرا گائیڈ تھا اور خود ہی بہتر جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کہاں جانا ہے۔ وہ بڑی کمری نگاہوں سے سرگھمائے بغیر تینوں جانب دیکھ رہا تھا۔ پھر خود ہی کہنے لگا۔
”ابھی تک خفیہ پولیس کا کوئی آدمی ہمارے پیچھے نہیں ہے۔ یہاں سٹیشن پر خفیہ پولیس اجنبی لوگوں کا ضرور پیچھا کرتی ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”ہمارا ہائیڈ آؤٹ کہاں ہو گا؟“

کمانڈو اورنگ زیب ان درختوں کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا جہاں شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”ابھی کچھ معلوم نہیں۔ اس کا فیصلہ اپنے آدمی شمس الدین سے ملنے کے بعد ہی ہو گا۔ اب میرے ساتھ آؤ۔ ہم ایک ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیئیں گے۔“

ہم اٹھ کر گراؤنڈ والے جنگل کے ساتھ ساتھ چلتے شملے کے اس بازار میں آگئے۔ جہاں ہر قسم کی دکانیں تھیں اور آبادی گنجان تھی۔ یہاں دیشنو ہوٹل کا ایک جگہ بورڈ لگا تھا۔ یہ ہوٹل ایک دکان کی طرح کا تھا۔ اندر کچھ لوگ بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ ہم

بھی اندر جا کر بیٹھ گئے۔

اورنگ زیب نے لڑکے کو دو چائے لانے کا کہا اور اپنے جوتوں کے تسمے درست کرتے ہوئے مجھے آہستہ سے کہا۔

”یہاں ہم اپنے آپ کو ہندو ظاہر کریں گے۔ جو چاہے اپنا ہندوانہ نام رکھ لیتا۔ ہمیں رات کا اندھیرا ہونے تک کچھ وقت گزارنا ہے۔“

ہوٹل میں مزدور پیشہ قسم کے پہاڑی لوگ بیٹھے چائے اور سگریٹ پیتے ہوئے اونچی آوازوں میں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے۔ دکانوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ بازار میں سے ہندو سکھ مرد اور عورتیں گزر رہی تھیں۔ کوئی شلوار قمیض پہنے ہوئی تھی ماتھے پر تلک لگا تھا۔ کوئی ساڑھیوں میں ملبوس تھیں اور کاندھوں پر گرم شالیں رکھی ہوئی تھیں۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد اورنگ زیب نے گھڑی پر وقت دیکھا اور بولا۔
”اب چلنا چاہئے“

ہم ہوٹل سے نکل کر بازار میں آگئے۔ دو تین بازاروں سے گزر گئے۔ تھوڑی چڑھائی چڑھنے کے بعد ایک چوک آگیا یہاں سے ایک سڑک نیچے بڑے بازار میں جاتی تھی۔ اس بازار میں بڑی عالی شان دکانیں تھیں۔ خوب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ایک دکان کے باہر کشمیر امپوریم کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ کشمیری شالوں اور لکڑی کے کام کے کشمیری نوادرات کی دکان تھی۔ کافی بڑی دکان تھی۔ ایک جانب دیوار پر پنڈت نہرو کی تصویر لگی تھی جس پر پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ گاہک کاؤنٹر کے پاس کھڑے نوادرات دیکھ رہے تھے۔ دکان کے آخر میں ایک کاؤنٹر کے پیچھے کرسی پر ایک ادھیڑ عمر کا کشمیری گرم سوٹر کوٹ اور گلوبند پہنے نظر کی عینک لگائے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کی دائیں جانب چھوٹی میز پر کچھ رجسٹر اور فائلیں پڑی تھیں۔ اورنگ زیب یونہی شوکیسوں میں نوادرات کو دیکھتا ہوا اس ادھیڑ عمر آدمی کے پاس آگیا۔ میں اس کے ساتھ ہی تھا۔ یہ شخص دکان کا مالک لگتا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب نے اس کے قریب جا کر کہا۔

”ہمیں چنار کی لکڑی کا قلمدان چاہئے کیا آپ کے پاس ہو گا؟“

اس آدمی نے اخبار پر سے نظریں ہٹا کر پہلے اورنگ زیب کو اور پھر میری طرف دیکھا۔ کہنے لگا۔

”اس وقت تو نہیں ہے۔ دو ایک روز میں مال آنے والا ہے شاید اس میں آجائے۔ آپ یہ قلمدان دیکھیں یہ دیوار کی لکڑی کا ہے“

اور اس نے شوکیس میں سے ایک قلمدان نکال کر ہمارے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ اورنگ زیب اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے قلمدان مجھے دکھا کر کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے شرم؟“

ہم دونوں قلمدان دیکھنے لگے۔ اس دوران اس ادھیڑ عمر کشمیری نے جو دکان کا مالک ہی تھا ایک کانڈ پر کچھ لکھا اور بڑی راز داری سے کانڈ کا ٹکڑا کمانڈو اورنگ زیب کے آگے کر دیا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کانڈ کے اس ٹکڑے کو پڑھے بغیر جیب میں رکھا اور قلمدان کو کاؤنٹر پر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”ہمیں چنار کی لکڑی کا قلمدان ہی چاہئے ہم پھر آجائیں گے۔“

ادھیڑ عمر آدمی نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا اور بڑی لا تعلقی سے کرسی پر بیٹھ کر دوبارہ اخبار پڑھنے لگا۔

ہم دکان سے باہر آگئے۔ کمانڈو اورنگ زیب مجھے ایک اور ریسٹوران میں لے گیا۔ یہ ذرا بہتر قسم کا ریسٹوران تھا اور پڑھے لکھے گاہک بیٹھے خاموشی سے چائے کافی پی رہے تھے۔ میں اور کمانڈو اورنگ زیب کو نے والی میز پر بیٹھے تھے۔ اس نے جیب سے دکاندار کا دیا ہوا کانڈ کا ٹکڑا نکال کر میز کے نیچے ساتھ لے جا کر پڑھا اور کانڈ کو مروڑ کر اس کی گولی بنا کر جیب میں رکھ لیا اور کہنے لگا۔

”یہ دکاندار ہمارا آدمی شمس الدین تھا۔ اس نے مجھے رات دس بجے کے بعد خفیہ ہائیڈ آؤٹ میں آنے کی ہدایت کی ہے۔“

”ہمیں پورے دس بجے یہاں سے نکل پڑنا ہے۔ ہائیڈ آؤٹ تک جاتے ہوئے بھی پندرہ بیس منٹ لگ جائیں گے“
وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وقت دیکھ لیتا تھا۔ فلم کافی لمبی تھی۔ آخری بار وقت دیکھ کر کمائڈو اورنگ زیب اٹھ کھڑا ہوا۔
”ہمیں چلنا چاہئے“

ہم گیلری کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئے۔ سردی کی وجہ سے سینما ہال کی لابی خالی پڑی تھی۔ ہم خاموشی سے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دیئے تیز تیز قدموں سے چلتے بازار میں ایک جانب مڑ گئے۔ اب اورنگ زیب میرا گائیڈ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ وہ شملے کی مال روڈ پر آگیا۔ مال روڈ کی اکثر دکانیں بند ہو چکی تھیں اور بازار تقریباً سنان تھا۔ یہاں سے ایک راستہ نیچے شملے کے تنگ بازار میں اترتا تھا۔ ہم اس بازار میں اتر گئے۔ یہاں اترائی تھی۔ دونوں جانب ڈھلانی چھتوں اور لکڑی کے چھجوں والے مکان ایک دوسرے میں گھسے ہوئے تھے۔ یہ مقامی آبادی والا بازار تھا۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جو کچھ کھلی تھیں۔ کچھ بند تھیں۔

ہم بازار میں کافی نیچے اتر گئے تو ایک پہاڑی ٹیلے کے پاس سے ہوتے ہوئے ہموار جگہ پر آگئے۔ یہ ایک ٹیرس تھا اس کے آگے پتھر کی سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کے آگے ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ یہاں سڑک کی بتیوں کی تھوڑی تھوڑی روشنی آرہی تھی۔ ہم اس روشنی میں نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اب ہم غیر آباد پہاڑی علاقے میں سے گزر رہے تھے۔ اورنگ زیب ایک جگہ نالے سے ہٹ کر دو ٹیلوں کے درمیان والے راستے پر آگیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ اس نے رک کر ایک ٹیلے کا جائزہ لیا پھر اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم ایک ایسی جگہ پر آگئے جہاں نیچے کچھ فاصلے پر کسی گاؤں کی روشنیاں جھلجھلائی نظر آرہی تھیں۔ ذرا چڑھائی چڑھ کر ایک جگہ درختوں میں مجھے اندھیرے میں ایک مکان دکھائی دیا۔ قریب گئے تو میں نے دیکھا کہ وہ لکڑی کا ایک کیبن تھا۔ اندھیرے میں اس کی ڈھلانی چھت ایک طرف کو جھکی ہوئی نظر

”یہ خفیہ ہائیڈ آؤٹ کہاں پر ہے؟“
میں نے پوچھا۔ کمائڈو اورنگ زیب نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرا ہمارے لئے چائے لے کر آ رہا تھا۔ میں نے چائے بنا کر اورنگ زیب نے سگریٹ سلگالیا۔
”ہمیں رات کے دس بجے تک وقت گزارنا ہے اور ابھی صرف سات ہی بجے ہیں۔ اس ریسٹوران میں زیادہ دیر بیٹھنا ٹھیک نہیں ہو گا۔“

”پھر تمہارا کیا مشورہ ہے؟“

میں نے پوچھا۔

اورنگ زیب کچھ سوچ کر بولا۔

”ہم کسی سینما ہاؤس میں وقت گزاریں گے“

ہم نے جلدی جلدی چائے پی اور ریسٹوران سے باہر آکر ایک جانب چل پڑے۔ دوسرے بڑے چوک کے کونے میں ایک سینما ہاؤس تھا جہاں کوئی انگریزی فلم لگی تھی۔ فلم شروع ہو چکی تھی مگر ٹکٹ والی کھڑکی کھلی تھی۔ ہم نے گیلری کے دو ٹکٹ لئے اور گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہال میں اندھیرا تھا۔ سکرین پر فلم کا سین چل رہا تھا۔ گیلری تقریباً خالی تھی۔ ہم ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں ہمارے آس پاس دو سرائے کوئی نہیں تھا۔ اورنگ زیب کہنے لگا۔

”شمس الدین یہاں ایک طرح سے ہمارا ماسٹر سپائی ہے۔ اس نے ہائیڈ آؤٹ میر ایک چھوٹا ٹرانسمیٹر سیٹ بھی چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ ہم وہاں سے کمائڈو شیروان سے بات کر سکیں گے“

”ہمارا مشن ذرا مشکل ہے۔ یہ ایکشن کا کم اور سراغ رسانی اور جاسوسی کا مشن زیادہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شمس الدین کے آدمی جاٹ رجمنٹ کے گیریزن سے پروین سراغ لگالیں گے۔ اس کے بعد ہمارا ایکشن کمائڈو مشن شروع ہو گا۔“

انٹروال کے وقت ہم نے وہیں سینما ہال میں ہی کچھ کھانے کے لئے منگوا لیا۔ انٹروال کے بعد فلم شروع ہوئی تو اورنگ زیب نے کلائی پر جھک کر وقت دیکھا۔ کہنے لگا۔

بٹی پروین کا سراغ مل سکے کہ اگر وہ جاٹ رجمنٹ کے ہیڈ کوارٹر یا گیرزن میں ہے تو اسے اسے کس مقام پر رکھا گیا ہے۔

اورنگ زیب شمس الدین کی ساری بات غور سے سنتا رہا کہنے لگا۔

”خواجہ صاحب! ہمیں صرف اتنا معلوم ہو جانا چاہئے کہ پروین کو رجمنٹل گیرزن میں اگر وہ وہاں پر ہے تو اسے کس بارک میں یا کس کمرے میں بند کیا گیا ہے۔ اس کے بعد وہاں سے اسے نکالنا ہمارا کام ہے۔“

ماسٹر سپائی شمس الدین کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔ ”کیا شملے کے اس گیرزن یا رجمنٹل ہیڈ کوارٹر میں اپنا کوئی ایسا آدمی ہے جو پروین کے بارے میں درست معلومات فراہم کر سکے؟“

شمس الدین بولا۔

”اپنا آدمی بھی ہے اور وہ درست معلومات بھی فراہم کر کے لے آئے گا لیکن وہی بات کہ اس میں ہو سکتا ہے تھوڑا وقت لگ جائے لیکن کمانڈر شیروان نے بتایا ہے کہ کرنل بھگت رام نے حاجی صاحب کو صرف تین دن کی مہلت دی ہے۔“

اورنگ زیب نے کہا۔

”یہ مہلت زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔“

اس پر شمس الدین بولا۔

”اور اگر کرنل بھگت رام نے مہلت نہ بڑھائی اور پروین کو ہلاک کر ڈالا تو یہ تو بڑی ہزیمت کی بات ہو گی۔ دنیا والے کیا کہیں گے کہ کشمیری کمانڈوز میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اتنے بڑے کشمیری بزرگ اور لیڈر کی بیٹی کو چھڑا سکتے؟“

کمانڈو اورنگ زیب بھی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے پوچھا۔

”آپ کے خیال میں پروین کا پتہ چلانے میں ہمارے آدمی کو اندازاً کتنا وقت درکار ہو گا؟“

شمس الدین بولا۔

آ رہی تھی۔ اس کے احاطے میں لکڑی کے دو تین بڑے بڑے بالے پڑے تھے۔

کمانڈو اورنگ زیب وہاں رک گیا۔ اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ پھر مجھے دیر ایک جانب اندھیرے میں رکنے کا کہہ کر آگے بڑھا۔ اس نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں سے پستول نکال کر اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اس کا سیدھا ہاتھ بھی پتلون کی جیب میں تھا۔ لکڑی کے کیبن کا دروازہ بند تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے دروازے پر ہاتھ سے تین بار خاص اشارے کے انداز میں دستک دی۔ اندر سے کسی نے دروازہ کھول دیا۔ کمانڈو اورنگ زیب اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ فوراً بند ہو گیا۔ میں لکڑیوں کے شہتیر وار کے پاس ایک طرف ہو کر اندھیرے میں کھڑا رہا۔ میری نگاہیں کیبن کے دروازے پر لگی تھیں۔ اتنے میں دروازے کی درزوں میں سے مجھے ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی۔ اندر کمرے نے شاید لمپ وغیرہ روشن کیا تھا۔ اتنے میں دروازہ دوبارہ کھلا۔ کمانڈو اورنگ زیب اشارے سے مجھے بلایا۔ میں کیبن میں چلا آیا۔

کیبن لکڑی کا بوسیدہ مگر کافی لمبا کھوکھا تھا جس کی دیواروں پر تھوڑا کر بنائی گئی تھیں۔ چھت لکڑی کی تھی۔ دیواروں کے ساتھ لکڑی کے کٹے ہوئے تختے لگے تھے۔ بائیں جانب والی دیوار کے ساتھ لکڑی کے لمبوترے صندوق ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ غور سے دیکھا تو وہ تابوت تھے جس میں مسیحی لوگ اپنی میتوں کو لٹا کر اپنے قبرستان میں دفن کرتے ہیں۔ اسی طرح کے دو تین تابوت فرش پر بھی پڑے تھے۔ ایک تابوت پر وہی کشمیر کے نوادرات کی دکان والا ادھیڑ عمر کشمیری یعنی شمس الدین بیٹھا تھا۔ فرش پر پتھر رکھا ہوا تھا جس پر موم بتی ابھی ابھی روشن کی گئی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اپنے ماسٹر سپائی شمس الدین سے میرا تعارف کرایا۔ شمس الدین نے نہ مجھ سے ہاتھ ملایا نہ میرے سلام کا جواب دیا۔ بس غور سے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کمانڈو اورنگ زیب سے کہنے لگا۔

”مجھے کمانڈر شیروان نے وائزلیس پر ساری بات بتادی ہے۔ یہ کام اتنی جلدی ہونے والا نہیں لگتا۔ پھر بھی میں پوری کوشش کروں گا کہ جتنی جلدی ہو سکے حاجی صاحب کی

”کل دن کے دس ساڑھے دس بجے تم اکیلے میری دکان پر آنا۔ دکان میں داخل ہونے کے بعد اوپر گیلری میں چلے جانا۔ میں وہیں آجاؤں گا۔ اب تم لوگ واپس چلے جاؤ۔ خیال رکھنا۔ اگر کوئی تمہارا پیچھا کر رہا ہو تو اسے اپنے پیچھے پیچھے نہ آنے دینا۔ راستے میں ہی موقع پا کر اسے ختم کر دینا۔ اب جاؤ۔“

ماسٹر سپاکی شمس الدین نے موم بتی پھونک مار کر بجھا دی۔ میں اور کمائڈو اورنگ زیب بوسیدہ تابوتوں والے کیمین سے باہر نکل کر اندھیرے میں جس طرف سے آئے تھے اس طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد کمائڈو اورنگ زیب نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ جلدی سے ایک طرف اندھیرے میں کیا اور عقاب ایسی چمکدار آنکھوں سے پیچھے اندھیرے میں گھورنے لگا۔ آہستہ سے بولا۔

”ہو سکتا ہے ہمارے پیچھے کوئی خفیہ پولیس والا لگا ہو۔ اگر ہوا تو ابھی سامنے آجائے گا۔“

ہم کوئی دو منٹ تک پہاڑی پگ ڈنڈی کے اس موڑ پر اندھیرے میں خاموش کھڑے رہے۔ مگر پیچھے سے کوئی آدمی نہ آیا۔ جب اورنگ زیب کو اطمینان ہو گیا تو مجھے لے کر آگے چل پڑا۔ میں نے اورنگ زیب سے پوچھا۔

”رات گزارنے کے لئے ہمارا ٹھکانہ کون سا ہو گا؟“

وہ چلتے چلتے کہنے لگا۔

”شملے کے اوپر بازار میں ہمارا ایک آدمی رہتا ہے۔ ہم اس کے پاس ٹھہریں گے“

رات کے سوا گیارہ بج رہے تھے جب ہم اوپر بازار کی ایک اونچی نیچی پہاڑی گلی میں اپنے آدمی کے مکان پر پہنچے۔ یہ چالیس بیالیس برس کا ایک مضبوط جسم والا مزدور ٹائپ کا آدمی تھا وہ ہمیں اوپر لے گیا۔ اس نے کوٹھڑی کھول دی۔ اندر زمین پر بستر بچھا ہوا تھا۔ کمائڈو اورنگ زیب نے اس آدمی سے کہا۔

”مدا مجھے دس بجے کے بعد شمس الدین کی دکان پر جانا ہے۔ نو بجے جگا دینا“

اس آدمی کا نام صدا تھا۔ کہنے لگا۔

”میں اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو اپنے آدمیوں سے مشورہ کرنے اور ان کے رائے معلوم کرنے کے بعد ہی کچھ پتہ چلے گا۔ ہو سکتا ہے۔ وہ کل شام تک آکر پروین ٹھکانہ بتا دیں۔ ہو سکتا ہے اس میں دو ایک دن لگ جائیں۔ حقیقت یہ ہے جیسا کہ تم فرم جانتے ہو اس قسم کے حالات میں سیکورٹی اتنی سخت کر دی جاتی ہے کہ سراغ لگانے کا سست ہو جاتا ہے۔ پھر تمہارے سری نگر والی چھاؤنی کو نیست و نابود کرنے کے بعد بھارت فوج میں سخت بے چینی پھیل گئی ہے۔ وہاں کے کمائڈو کرمل بھگت رام کے لئے یہ اس کا ساکھ ہی نہیں بلکہ فوجی کیریئر کا مسئلہ بن چکا ہے۔ چنانچہ ان حالات میں پروین اس کے ہاتھ میں آیا ہوا ایک مرہ ہے جس سے وہ بازی جیت بھی سکتا ہے اور بساط الٹ بھی سکتا ہے لازمی طور پر یہاں ملٹری کی سیکورٹی بہت زبردست کر دی گئی ہوگی۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ کام میں جتنی جلدی ہو سکا کرانے کی کوشش کروں گا۔ میں صبح صبح رحیم کے پاس جاؤں وہ پہلے رات کو بھی یہیں سوتا تھا مگر اب لوئر بازار والے اپنے مکان میں چلا جاتا ہے۔ ایسا کرنا۔ کل دن کے دس گیارہ بجے کے دوران میرے پاس دکان پر آجانا۔ میں تمہیں ساری صورت حال بتا دوں گا۔“

میں اس دوران لکڑی کے تابوت پر بیٹھا خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ شمس الدین نے پوچھا۔

”تم لوگوں کا کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا تھا؟“

کمائڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”مجھے یقین ہے ہمارے پیچھے کوئی انٹیلی جنس والا نہیں تھا“

شمس الدین نے کہا۔

”تم لوگوں کو ساتھ ساتھ نہیں پھرنا چاہئے۔ میری دکان پر تم اکیلے ہی آنا۔ اب ساتھی کمائڈو کو بے شک اس کوٹھڑی میں ہی چھوڑ آنا۔ یہ تالے کی ایک چابی اپنے پاس رکھ لو۔“

اس نے جیب میں سے ایک چابی نکال کر کمائڈو اورنگ زیب کو دی اور کہا۔

وہاں ہر وقت تین مسلح سپاہی پہرے پر ہوتے ہیں۔ گیرزن کے اندر دن کے وقت باہر سے جانے والے ہر سولین کی پوری تلاشی لی جاتی ہے۔ رات کے وقت کسی سولین کو گیرزن میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ گیرزن کے آس پاس کی پہاڑیوں پر بھی فوجی گشت لگاتے رہتے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد دور بیٹوں سے کوارٹر گارڈ کی دوسری منزل کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو اس بات کا شدید خطرہ لگا ہوا ہے کہ کشمیری کمانڈوز پروین کو چھڑانے کے لئے ضرور اٹیک کریں گے۔“

میں نے شمس الدین سے پوچھا۔
 ”کوارٹر گارڈ کی دوسری طرف کیا ہے؟“
 ”تمہارا مطلب اس کے عقب سے ہے؟“
 ”ہاں“
 شمس الدین نے کہا۔

”میں دوسرے کے بعد خود یہ جگہ دور ایک پہاڑی سے دیکھ کر آیا ہوں۔ کوارٹر گارڈ کی بچے کی جانب گہری کھڈ ہے پتھر کی دیوار کھڈ کی تہہ سے کوارٹر گارڈ کی دوسری منزل تک بالکل سیدھی چلی گئی ہے۔ رات کے وقت اب وہاں خاص طور پر ایک سرچ لائیٹ لگا دی گئی ہے جو ساری رات روشن رہتی ہے۔“
 کمانڈو اورنگ زیب گہری سوچ میں تھا۔ شمس الدین ”کہنے لگا۔

”مہلت کی مدت میں صرف کل اور پرسوں کا دن رہ گیا ہے۔ میں کوارٹر گارڈ کا جو نقشہ دیکھ کر آیا ہوں میں نہیں سمجھتا کہ وہاں ہمارا کوئی کمانڈو پہنچ سکے گا۔ اور پھر صرف ہاں پہنچنا ہی نہیں ہے وہاں مسلح فوجیوں کی موجودگی میں پروین کو نکال کر بھی لانا ہے۔ بچے سے اوپر جانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ گیرزن میں سیکورٹی اس قدر سخت کر دی گئی ہے کہ اپنے مسلمان کشمیری ساتھیوں کو بھی جو گیرزن کے اندر باغبانی اور رسوائی وغیرہ میں اہل کرتے ہیں سخت چینگ کے بعد اندر جانے دیا جاتا ہے۔“
 میں نے شمس الدین سے کہا۔

”جگا دوں گا۔ اس وقت سو جاؤ“

اس نے دو لحاف لا کر رکھ دیئے اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کمانڈو اور زیب کہنے لگا۔

”بازار میں اس کی تیل اور گیس کے چولے مرمت کرنے کی دکان ہے۔ یہ کشمیری مجاہد کا بڑا بااعتماد ساتھی ہے۔ اس کا کام صرف ضرورت پڑنے پر ہمارے رات بسر کرنے کا انتظام کرنا ہے۔“
 اس کے بعد سو گئے۔

صبح ٹھیک نو بجے صمد نے ہمیں جگا دیا۔ ہم نے ناشتہ کیا۔ اور سوا دس بجے تو اور زیب نے مجھے کہا۔

”تم یہاں رہو گے۔ میں شمس الدین سے مل کر حالات کا پتہ کر کے آتا ہوں“

وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی واپس آگیا اور بولا۔

”جس آدمی کی شمس الدین نے ڈیوٹی لگائی ہے وہ ابھی پروین کے بارے میں پو معلومات لے کر واپس نہیں آیا۔ شمس الدین نے کہا ہے کہ ہم لوگ صمد کے مکان پر ٹھہریں۔ وہ خود آکر ہمیں ملے گا۔“

صمد مکان کو باہر سے تالا لگا کر دکان پر چلا گیا تھا۔ ہمارے لئے اس نے کھانے پینے سامان رکھ دیا تھا۔ ہم اس کے مکان کی دوسری منزل کی کوٹھڑی میں سارا دن بیٹھے رہے۔ اس کی مکان کی پچھلی کھڑکی ایک وادی کی طرف کھلتی تھی۔ اس طرف سے دھوپ آ رہی تھی۔ صمد نے ہمیں بازار والی کھڑکیاں کھولنے سے منع کیا تھا۔ دوپہر گزر گئی۔ گزر گئی۔ رات ہوئی تو شمس الدین آیا۔ کہنے لگا۔

”حاجی صاحب کی یرغالی بیٹی پروین کا سراغ مل گیا ہے۔“

ہم خوش ہوئے۔ شمس الدین کو ٹھڑی میں ہمارے پاس ہی زمین پر بچھی ہوئی درد بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔

”پروین کو فوجی گیرزن کی کوارٹر گارڈ کے اوپر والے کمرے میں بند کیا ہوا۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے میری طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر میرا نام لے کر بولا۔

”ہم اپنے ٹارگٹ تک پہنچ گئے ہیں لیکن ٹارگٹ تک پہنچنے کا صرف ٹریک بدل دیا ہے“

میں نے اس وقت اورنگ زیب سے کوئی تفصیل نہ پوچھی۔ وہ شمس الدین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”شمس الدین خواجہ! بریگیڈیئر شیاہا پر شاد مکرچی کی جوان بیٹی کہیں پڑھتی ہے؟“

شمس الدین موضوع کے اچانک بدل جانے پر کچھ تعجب میں تھا۔ کہنے لگا۔

”ہاں وہ کونین الزبتھ کالج میں پڑھتی ہے۔“

کمانڈو اورنگ زیب ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

”ہمارے پاس اتنا وقت نہیں رہا کہ ہم گیریزن کے کوارٹر گارڈ کی دوسری منزل میں پروین تک پہنچنے کی کوئی سکیم تیار کریں۔ اس کے لئے باقاعدہ منصوبے کی ضرورت ہے اور مہلت کی مدت پر سوں تک ختم ہو جائے گی۔ بہت ممکن ہے کہ کرنل بھگت رام انتقام کے جذبے میں آکر پروین کو ہلاک کرنے کی حماقت کر بیٹھے اس لئے ہم ایک فوری منصوبے پر عمل کریں جس کی کامیابی کا مجھے سو فیصد یقین ہے“

”وہ کیا ہے؟“

شمس الدین نے کسی قدر حیرانی کے ساتھ پوچھا۔ میں کمانڈو اورنگ زیب کے منصوبے کو سمجھ چکا تھا۔ اورنگ زیب نے بڑے پختہ عزم مگر دھیمی آواز میں کہا۔

”ہم بریگیڈیئر شیاہا پر شاد مکرچی کی بیٹی کو اغوا کر کے یہ غالی بنائیں گے“

شمس الدین اس کا منہ تکتے لگا۔ پھر بولا۔

”یہ بڑا خطرناک کام ہو گا۔ دشمن کے گھر میں بیٹھ کر اس کی بیٹی کو اغوا کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے میرے نزدیک۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”لیکن کچھ بھی ہو ہمیں پروین کو ہر حال میں وہاں سے نکالنا ہے۔“

شمس الدین کہنے لگا۔

”وہ تو تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ تم لوگ جان کی پروا

کئے بغیر اس مشن پر چل پڑو گے۔ لیکن اس سے کیا حاصل کہ مشن بھی مکمل نہ ہوا اور جان بھی چلی گئی؟“

اس دوران کمانڈو اورنگ زیب خاموش تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ شمس الدین۔

بات ختم کی تو اس نے سوال کیا۔

”گیریزن کمانڈو کون ہے؟“

شمس الدین نے کہا۔

”اس کا نام بریگیڈیئر شیاہا پر شاد مکرچی ہے وہ جاٹ رجمنٹ کا بریگیڈیئر ہے“

گیریزن کا آفسر کمانڈنٹ ہے۔ مگر تم اس کا کیوں پوچھ رہے ہو؟“

کمانڈو اورنگ زیب کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے دماغ میں کوئی دوسری ہی سکیم ہے

کوئی دوسرا ہی مشن ہے۔ اس نے کہا۔

”تم یہ بات چھوڑ دو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ بریگیڈیئر گیریزن کے اندر رہتا ہے یا سڑ

سے باہر؟“

شمس الدین نے کہا۔

”وہ گیریزن کے پیچھے ایک خوبصورت باغیچے والی چار کنال کی کوٹھی میں رہتا۔“

کوٹھی کے اندر سوئمنگ پول بھی ہے“

کمانڈو اورنگ زیب کے چہرے پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ جیسے اسے اپنا کوئی نیا

کامیاب ہوتا نظر آ رہا ہو اس نے بڑے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”وہ اکیلا رہتا ہے یا فیملی بھی اس کے ساتھ ہے؟“

”پوری فیملی اس کے ہاتھ رہتی ہے۔ اس کی موٹی بنگالن بیوی اپنی جوان لڑکی

ساتھ ہماری دکان میں چیزیں خریدنے آتی رہتی ہے۔“

”کمانڈو کا کام ہی دشمن کے گھر میں جا کر انٹیک کرنا ہوتا ہے۔ تم صرف ہمیں یہ پتہ کرا دو کہ گیریزن کمانڈو بریگیڈ تیر شیا پر شاد کی بیٹی کا نام کیا ہے اور وہ کالج کس وقت جاتی ہے اور اسے کون کالج لے جاتا ہے“

شمس الدین بولا۔

”پتہ کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ اس کی بیٹی کا نام ارملہ کمری ہے۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے کالج لگتا ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں جاتی ہے۔ اپنی گاڑی میں وہ ہماری دکان پر بھی آتی جاتی رہتی ہے۔ نیلے رنگ کی فیٹ گاڑی ہے مجھے اس کا نمبر بھی یاد ہے ایس ایم ۲۱۶ ہے۔“

”کیا تم ہمیں اس کی شکل دکھا سکتے ہو؟“

شمس الدین اب ہمارے نئے منصوبے کے ساتھ برابر تعاون کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”اس کے لئے صبح آٹھ بجے بڑے ڈاک خانے کے پیچھے جہاں مال روڈ گھوم کر کوئٹہ انز تھ کالج کی طرف جاتی ہے وہاں کرشناٹی شال کے کھوکھے کے پاس آجاتا۔ مٹی شال اس وقت بند ہوتا ہے۔ میں وہاں پہلے سے موجود ہوں گا۔ بریگیڈ تیر کی بیٹی کالج جاتے ہو۔ روزانہ وہیں سے گزرتی ہے۔ موٹر کی وجہ سے گاڑی کی رفتار بھی ہلکی ہو جاتی ہے۔ تم اسے اچھی طرح سے دیکھ سکو گے۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم دونوں صبح آٹھ بجے کرشناٹی شال کے پیچھے آجائیں گے۔“

شمس الدین اٹھ کھڑا ہوا۔ جانے سے پہلے کہنے لگا۔

”اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے پیچھے کوئی خفیہ پولیس کا آدمی نہ لگ جائے“

”شمس الدین تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہم خفیہ پولیس والوں کو اس کی چال سے پہچا

لیتے ہیں“

جب شمس جا چکا تو میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

”مجھے تمہاری سکیم سے پورا اتفاق ہے قدرت نے یہ ہمیں بڑا اچھا موقع دیا ہے۔“

سوال یہ ہے کہ ہم بریگیڈ تیر کی بیٹی کو اغوا کرنے کے بعد رکھیں گے کہاں؟“

کمانڈو اورنگ زیب نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا۔

”خواجہ صاحب! اس طرف سے تم بے فکر رہو میرے پاس یہاں شملے میں بڑے

خفیہ ہائیڈ آؤٹ ہیں۔ ہم یونہی کشمیر کی جنگ میں بھارتی فوجیوں کو ناکوں چنے نہیں چھو رہے۔“

رات ہم نے اپنے مجاہد صمد کے ٹھکانے پر ہی گزاری۔ دوسرے روز صبح پورے آٹھ بجے میں اور کمانڈو اورنگ زیب شملہ کے بڑے ڈاک خانے کے پیچھے کرشناٹی شال کے بند کھوکھے کی اوٹ میں موجود تھے۔ اتنے میں شمس الدین بھی آگیا۔ اس نے لوٹی کی بکل ماری ہوئی تھی۔ وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ سورج اگرچہ شملے کے آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا لیکن دن کی کافی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

شمس الدین ہمیں لے کر سڑک کے کنارے ایک ایسی جگہ درختوں کی اوٹ میں آگیا جہاں سے سڑک موڑ کاٹتی تھی اس نے کہا۔

”تھوڑی دیر میں ارملہ کمری کی گاڑی آنے ہی والی ہے۔ اس کے کالج کا نام ہو گیا ہے۔“

ایک فوجی گاڑی گزر گئی۔ اس کے بعد ایک بڑا چار نشستوں والا رکشا گزر گیا۔ اس میں سنوڈنٹ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ پھر موٹر کے پیچھے گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ شمس الدین نے کہا۔

”ارملہ کی گاڑی آرہی ہے۔ میں اس کے ہارن کی آواز پہچانتا ہوں“

ایک فیٹ گاڑی پوسٹ آفس کی عمارت کا موڑ کاٹ کر ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ شمس الدین اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ ارملہ کی گاڑی ہے۔“

جب گاڑی قریب آئی تو جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔

”گاڑی میں فوجی سپاہی بھی بیٹھا ہے۔“

بٹی کو اغوا کر کے اپنے خفیہ ہائیڈ آؤٹ پر لے جانا چاہتے تھے اور اس کام کے لئے ہمیں کم از کم پندرہ بیس منٹ کی خاموش مہلت چاہیے تھی۔ لیکن گاڑی میں مسلح گارڈ کی موجودگی نے ہمیں اپنے مشن پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

کمانڈو اورنگ زیب بھی بالکل میری طرح سوچ رہا تھا۔ اس نے شمس خواجہ کے آگے انہی خیالات کا اظہار کیا۔ شمس خواجہ کہنے لگا۔

”پھر تم لوگوں نے کیا سوچا ہے؟“

کمانڈو اورنگ زیب نے شمس خواجہ سے پوچھا۔

”بریگیڈئیر کی لڑکی ارملہ مکرجی اور کہاں کہاں جاتی ہے؟ میرا مطلب ہے شام کے وقت کسی کلب یا آفیسر میس وغیرہ میں ضرور جاتی ہوگی“

شمس خواجہ غور کرنے کے انداز میں بولا۔

”یہ تو معلوم کرنا پڑے گا“

میں نے کہا۔

”خواجہ! ہمارے پاس تم جانتے ہو کہ وقت بالکل نہیں ہے۔ کل پروین کی مدت مہلت ختم ہونے والی ہے۔ یہ معلومات تم کتنی دیر میں حاصل کر سکتے ہو؟“

شمس خواجہ بولا۔

”آج کا سارا دن تو ضرور لگ جائے گا اس کے لئے مجھے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگانی پڑے گی جو ساری رپورٹ حاصل کر کے مجھے شام یا رات کے وقت ہی کچھ بتا سکے گا۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

”دوست! اس کے سوا کوئی چارہ نہیں یہ بات طے ہے کہ ہم اپنے محدود وسائل میں کالج جاتی ہوئی ارملہ مکرجی کو اغوا نہیں کر سکتے۔ ہمیں اسے کسی دوسری جگہ سے اٹھانا ہو گا۔ بہتر یہی ہے کہ ارملہ جہاں جہاں جاتی ہے اس کے بارے میں مکمل تفصیلات معلوم کی جائیں“

کمانڈو اورنگ زیب شمس خواجہ سے کہنے لگا۔

میری اور کمانڈو اورنگ زیب کی نگاہیں گاڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ گاڑی کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ گاڑی ایک سانولے رنگ کی نوجوان لڑکی چلا رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر ایک فوجی سپاہی شین گن لئے بیٹھا چاروں طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ گاڑی آگے نکل گئی۔ میں۔ شمس الدین سے کہا۔

”اس کے ساتھ فوجی گارڈ کیوں تھا؟“

کمانڈو اورنگ زیب نے پوچھا۔

”کیا فوجی گارڈ روز اس لڑکی کے ساتھ آتی ہے؟“

ہم درختوں کے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ شمس الدین نے کہا

”پہلے کبھی گارڈ اس لڑکی کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ میرا خیال ہے سری نگر میں چھاء پر کمانڈو انیک اور حاجی صاحب کی بیٹی کو یہ غمال بنانے کے بعد بریگیڈئیر شیا پر شاد نے بیٹی کی سیکورٹی کے لئے گارڈ ساتھ لگا دیا ہے۔“

میں اور کمانڈو اورنگ زیب خاموش تھے۔ شمس الدین بولا۔

”تم لوگوں نے بریگیڈئیر کی بیٹی کو اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے نا؟“

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”ہاں دیکھ لیا ہے خواجہ۔“

شمس الدین پوچھنے لگا۔

”فوجی ہاڈی گارڈ کی موجودگی میں تمہارا منصوبہ مشکل نہیں ہو گیا؟“

اگرچہ ہاڈی گارڈ ایک ہی تھا اور ہمارا منصوبہ مشکل نہیں ہو گیا تھا لیکن اس پر بار پھر غور کرنے کی ضرورت ضرور پڑ گئی تھی۔ سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ شملہ ہمارے کمانڈو انیک کے وسائل اتنے کارگر نہیں تھے کہ ہم ارملہ کو اغوا کرتے وقت تربیت یافتہ مسلح فوجی ہاڈی گارڈ کا مسئلہ بھی حل کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا ہم سب سے پہلے اسے گولی مارتے۔ مگر اس سے علاقے میں شور مچ جاتا اور چوک تعینات فوجی چوکی کے سپاہی بھی آکر فائر کھول سکتے تھے۔ ہم بڑی خاموشی سے بریگیڈ

”ٹھیک ہے خواجہ۔ یہ ہماری مجبوری ہے۔ مگر تم جتنی جلدی معلومات حاصل ہو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اس دوران ہم آج رات کمانڈو شیروان سے سیٹ پر رابطہ پیدا کر کے معلوم کریں گے کہ کرنل بھگت رام نے مہلت کی مدت ہے یا وہاں کیا صورت حال ہے۔“

شمس خواجہ بولا۔

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ تابوت والے کیبن میں رات کو آجانا۔ میں بھی رات بچے کے بعد پہنچوں گا۔“

پھر اس نے کمانڈو اورنگ زیب سے خاص طور پر کہا۔

”وہاں جس خفیہ جگہ پر ٹرانسیٹر سیٹ چھپایا ہوا ہے وہ جگہ تمہیں معلوم ہی مجھے آنے میں اگر دیر ہو گئی تو تم کمانڈو شیروان سے وائرلیس پر رابطہ قائم کر لیتا۔ خفیہ سگنل کا کوڈ معلوم ہی ہے۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ اب ہم جاتے ہیں۔ رات کو تم سے تابوتوں والے کیبن میں ہوگی۔ کیا رحیم اس وقت وہاں موجود ہو گا؟“

شمس خواجہ بولا۔

”نہیں۔ اس کی وہاں موجودگی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسے منع کروں گا۔

میں تم دونوں اکیلے ہو گے۔ خدا حافظ!“

یہ کہہ کر شمس خواجہ نے لوٹی کی بکل ماری اور نشیب کی جھاڑیوں میں اتر بھی وہاں سے سڑک پر آئے۔ ہم واپس صدمہ کے مکان میں نہ گئے۔ بلکہ وہیں سے بوڑ بازار کی طرف سے گزر کر نیچے ایک چھوٹے سے باغیچے میں آگئے جہاں چھوٹی گاہ بنی ہوئی تھی۔ سردی اور آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کی وجہ سے سیر گاہ تھی۔ ایک جانب چھوٹا سا ہوٹل بنا ہوا تھا۔ اس کے اندر دو ایک غیر ملکی سیاح وغیرہ بیٹھے تھے۔ یہ ہوٹل لکڑی کے کیبن میں بنا ہوا تھا۔ باہر دو چار کرسیاں اور

بنی نہیں۔ سردی ہو گئی تھی اور ہوا بھی چل رہی تھی۔ ہم وہاں سے دور جا کر ایک جگہ درختوں میں بیٹھ گئے۔ ہم نے ارٹا کو اغوا کرنے کے لئے جو حکمت عملی تبدیل کی تھی اس کی تفصیلات پر اور اس کے خطرات پر گفتگو کرنے لگے۔ ہم کافی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ پھر اٹھ کر ہوٹل کے کیبن میں آگئے۔ وہاں ہم نے تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ کچھ کھانا ساتھ بندھوا لیا اور ایک طرف چل پڑے۔ کمانڈو اورنگ زیب ان تمام راستوں سے واقف تھا۔ کھڈ نالوں اور چھوٹی کھائیوں والے پہاڑی راستوں پر سے ہوتے ہوئے ہم اس مقام پر آگئے جہاں سے تابوتوں والا لکڑی کا بوسیدہ کیبن دور درختوں میں نظر آنے لگا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”شملے میں ادھر ادھر پھرنے سے بہتر ہے کہ ہم اس جگہ دن کا باقی وقت زگاریں۔“ چابی اورنگ زیب کے پاس ہی تھی۔ کیبن میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے چاروں طرف ماحول کا پورا جائزہ لے لیا تھا کہ کوئی شخص ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ ابھی تک شملہ میں کوئی خفیہ پولیس والا ہمارے پیچھے نہیں لگا تھا۔ یہ ایک اچھا اتفاق تھا۔ کیبن میں آکر ہم نے دروازہ بند کر کے اندر کنڈی لگا دی۔ ایک چھوٹے سے روشندان میں ابر آلود دن کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ہم نے لکڑی کے تابوتوں کے درمیان تھوڑی سی جگہ بنائی اور تابوتوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ہمیں سارا دن وہاں بسر کرنا تھا۔ اورنگ زیب اپنا پستول نکال کر رومال سے اسے چمکانے اور اس کے میگزین کو چیک کرنے لگا۔ میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ جب میں نے اورنگ زیب سے پوچھا کہ ہمیں اس مشن میں خود کار اسلحہ کی ضرورت پڑے گی۔ وہ کہاں سے آئے گا؟ تو کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ بلکہ سمجھو کہ اس کا انتظام پہلے سے ہو چکا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ بریگیڈئیر کی بیٹی ارٹا کو ہمیں اغوا کہاں سے کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں اس قسم کے حالات ہوں کہ ہمیں اسلحہ کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ بہر حال ہم ایک ایک پستول اور دستی بم ضرور اپنے پاس رکھیں گے۔“

اس کے بعد اورنگ زیب اٹھا اور کہنے لگا۔

”میرے ساتھ آؤ۔ میں نیچے تمہارے خلعے میں جا کر ٹرانسمیٹر سیٹ کو چیک کرنا ہوں“

اس کیمبن کے نیچے ایک چھوٹا سا تہ خانہ تھا۔ اس تہ خانے میں جانے کا دروازہ دیوار کے ساتھ جہاں لکڑی کے بڑے بڑے تختے کھڑے کئے ہوئے تھے ان کے پیچھے لکڑی کے فرش میں سے جاتا تھا۔ اورنگ زیب نے تختوں کے پیچھے آکر ایک جگہ سے فرش تختے کو اوپر اٹھایا تو ایک تنگ زینہ نیچے جاتا نظر آیا۔ ہم زینہ اتر کر تہ خانے میں آئے اورنگ زیب نے ماچس جلا کر وہاں رکھی ہوئی موم بتی روشن کر دی۔ موم بتی کی روشنی میں چھوٹی سی میز پر ایک وائریس ٹرانسمیٹر سیٹ پڑا نظر آیا۔ یہ بیٹری سیٹ تھا۔ کما اورنگ زیب نے اس کے دو تین بٹن دبا کر اسے اون کیا۔ اس میں سے ٹون کی آواز تو اس نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ بولا۔

”کمانڈر شیروان کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کا ہمارا وقت رات نو بجے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس وقت ہمیں کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں ہے۔ رات کو اس سے بات کر گے۔ خدا کرے کہ اس بد بخت کو قتل بھگت رام نے مہلت کی مدت بڑھا دی ہو۔ کیا ہمارا کام لمبا ہے۔ اس میں ہو سکتا ہے دو دن لگ جائیں۔“

ہم تہ خانے سے نکل کر واپس تابوتوں کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

”شمس خواجہ رات گیارہ بجے سے پہلے نہیں آئے گا۔“

وہ بولا۔

”ہو سکتا ہے پہلے آجائے۔ اگر اس کا آدمی ارملہ مکرچی کی مصروفیات کی رپورٹ کر پہلے آئے گا تو وہ رات کا اندھیرا ہوتے ہی آجائے گا۔ معاملے کی نزاکت کا اسے احساس ہے“

دوپہر کے بعد ہم نے سیرگاہ کے ریستوران سے لایا ہوا کھانا کھایا باہر جا کر چشے

بانی پیا۔ چشے پر ہم بڑی احتیاط سے چاروں طرف سے چوکس ہو کر باری باری گئے۔ اس کے بعد واپس آکر تابوتوں کے پاس بیٹھ گئے۔ ہم نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر بند کر دیا تھا۔ آخر دن گزر گیا۔ شام ہو گئی۔ پھر رات ہو گئی اور اندھیرا چھا گیا۔ ہم نے ایک ہفت کی اوٹ میں پتلی سی موم بتی روشن کر دی تھی۔ ہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی اپنی گھڑیوں پر وقت دیکھ لیتے تھے۔ جب رات کے پورے دس بج گئے تو باہر ہمیں کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ اورنگ زیب نے پھونک مار کر موم بتی بجھا دی اور پستول لے کر دروازے کے پاس چلا گیا۔ میں بھی ہو شیار ہو کر دروازے کی دوسری جانب کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں دروازے پر خاص انداز میں دستک ہوئی۔ یہ شمس خواجہ تھا۔ اورنگ زیب نے کنڈی اتار کر دروازے کو ذرا سا کھول کر اندھیرے میں شمس خواجہ کو پہچان کر دروازہ کھول دیا۔ شمس خواجہ نے اسی طرح لوٹی اوڑھی ہوئی تھی۔ میں نے موم بتی روشن کر دی۔ شمس خواجہ ہمارے قریب آکر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

”ہمارے آدمی نے جو معلومات لا کر مجھے دی ہیں وہ حوصلہ افزا نہیں ہیں۔“

ہم پوری توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ کمانڈر اورنگ زیب نے کہا۔

”جو کچھ رپورٹ ملی ہے اسے بیان کر دو۔ بعد میں ہم سوچ لیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔“

شمس خواجہ کی زبانی معلوم ہوا کہ بریگیڈیئر شیاہا پرشاد کی بیٹی ارملہ پہلے شام کے بعد اپنے باپ کے ساتھ آفیسر میس میں ضرور جایا کرتی تھی مگر جب سے سری نگر میں کشمیری مجاہدین کی سرگرمیاں تیز ہو گئی ہیں اور سری نگر کے گیریزن کو تباہ کیا گیا اور حاجی صاحب کی بیٹی کو فوج نے یہ غمال بنایا تھا اس کے بعد سے ارملہ نے باپ کے ساتھ آفیسر میس میں جانا بند کر دیا ہے۔ وہ ہفتے میں تین بار رات کے وقت تھوڑی دیر کے لئے شملہ کی لیڈیز کلب بھی جاتی تھی لیکن اب اس کا وہاں جانا بھی موقوف ہو گیا ہے۔ جب شمس خواجہ نے اپنی بات ختم کی تو اورنگ زیب بولا۔

”اس کا مطلب ہوا کہ ہم ارملہ کو سوائے اس کے گھر کے اور کسی جگہ سے اغوا نہیں

جب وہ چلا گیا تو میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔
 ”یہ لوگ ہمارے لئے خود کار اسلحہ وغیرہ کا انتظام کر دیں گے؟“
 اس نے کہا۔

”ہمیں جس چیز کی ضرورت ہوگی وہ مل جائے گی۔ بے فکر رہو“
 ہم نے رات اسی کیبن میں مردوں کے خالی تابوتوں کے پاس گزارنے کا فیصلہ کیا اور
 وہیں جگہ بنا کر لیٹ گئے۔ کمانڈو جہاں چاہے سو سکتا ہے۔

کیپ سے رہا کر کے سری نگر اس کے ماں باپ کے پاس نہیں پہنچا دیا جاتا۔“
 شمس خواجہ بولا۔

”اس کے لئے قبرستان والا تمہ خانہ بڑا مناسب رہے گا۔“

کمانڈو اورنگ زیب جو اس تمہ خانے سے واقف تھا کہنے لگا۔

”ہاں! میرے خیال میں وہ تمہ خانہ ٹھیک رہے گا۔ وہاں ساتھ چھوٹا باتھ روم بھی
 ہے۔ ہم اگر اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو بریگیڈئیر کی بیٹی کو تو ہم وہیں لے جائیں
 گے۔ اس وقت وہاں کمانڈو رحیم تابوت ساز کو اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ موجود ہونا چاہئے
 اور ان تینوں کے چہرے نقاب میں چھپے ہوئے ہوں گے۔ ہمیں اپنے چہرے چھپانے کی
 ضرورت نہیں ہوگی۔“
 شمس خواجہ نے کہا۔

”مشن پر جانے سے پہلے تم لوگ مجھے خبر کر دو گے۔ اس کے بعد کامیابی کی صورت
 میں تم بریگیڈئیر کے بنگلے سے نکل کر اس کچی سڑک پر آؤ گے جو ڈگی کو جاتی ہے۔ وہاں
 کمانڈو رحیم ویگن لے کر پہلے سے تمہارے انتظار میں موجود ہو گا۔ اگر تمہارا مشن ناکام
 ہو گیا تو وہ تمہیں وہاں نہیں ملے گا۔ مشن کی ناکامی کی صورت میں کوٹھی میں شور ضرور
 مچے گا اور فائرنگ بھی ہو سکتی ہے ان آوازوں کو سنتے ہی رحیم وہاں سے ویگن بھاگ کر لے
 جائے گا۔ پھر اگر تم لوگ زندہ بچ گئے تو تمہیں خود وہاں سے فرار ہونا ہو گا“

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”میں سب سمجھتا ہوں۔ تم کو شش کرنا کہ کل شام تک بریگیڈئیر کے بنگلے کا اندرونی
 سارا نقشہ ہمیں مل جائے۔ اس دوران ہم یہاں اس کیبن میں نہیں ہوں گے۔ ہم کل
 سورج غروب ہونے کے بعد یہاں آئیں گے۔ پھر جیسی صورت حال ہوئی اس کے مطابق
 اپنے کمانڈو مشن کے وقت کا فیصلہ کیا جائے گا۔“

شمس خواجہ بولا۔

”بہتر ہے۔ اب میں جاتا ہوں“

یہ ساتھ والا بیڈ روم جو ہے اس میں بریگیڈئیر کی دونوں چھوٹی بیٹیاں سوتی ہیں اور یہ جو کونے والا بیڈ روم ہے یہ بریگیڈئیر کی بڑی بیٹی ارملہ کا ہے۔ اس کے بارے میں اس عورت نے بتایا ہے کہ وہ رات کو دس بجے اپنے بیڈ روم میں آجاتی ہے۔ بیڈ روم میں وہ رات کے گیارہ بجے تک کتابیں پڑھتی ہے۔ اس کے بعد سو جاتی ہے مگر اس کے سرہانے کی تپائی پر رکھا ہوا ٹیبل لیپ ساری رات روشن رہتا ہے۔ اس کی روشنی بہت ہلکی ہوتی ہے۔ باغیچے سے ارملہ کے بیڈ روم میں جانے کا کوئی دروازہ نہیں ہے۔ صرف اس کے ہاتھ روم کی کھڑکی جو اندر سے بند رکھی جاتی ہے وہاں کام کرنے والی اپنے گروہ کی عورت نے وعدہ کیا ہے کہ جس رات تمہیں اپنے مشن پر جانا ہو گا وہ لڑکی کے ہاتھ روم کی کھڑکی کی چنجی اندر سے کھول دے گی۔“

”کیا وہ ایسا کر سکے گی؟“

اورنگ زیب نے پوچھا۔

شمس خواجہ نے کہا۔

”اس نے مجھے یقین دلایا ہے۔ اگر تم کل رات اس مشن پر روانہ ہونے والے ہو تو مجھے ابھی بتا دو۔ میں صبح اسے اپنے جاسوس کے ہاتھ پیغام بھجوا دوں گا۔ تمہیں ہاتھ روم کی کھڑکی کھلی ہوئی ملے گی۔“

میں نے نقشہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہاں رات کو فوجی گارڈ کہاں کہاں ڈیوٹی پر ہوتے ہیں؟“

شمس نے کہا۔

”میری اطلاع کے مطابق پہلے صرف ایک فوجی سپاہی بریگیڈئیر کی کوٹھی کے باہر پہرہ دیتا تھا لیکن اب اس کے علاوہ رات کو بھی اور دن کے وقت بھی دو مسلح فوجی کوٹھی کی دیوار کے گرد گشت لگاتے رہتے ہیں۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”میں اس علاقے سے تو واقف ہوں جہاں بریگیڈئیر کی کوٹھی ہے مگر میں نے یہ

شملے میں بھی اپنے کشمیری مجاہدین کی سراغ رسانی کا نظام حیرت انگیز اور حوصلہ افزا تھا۔ اپنے محدود اور محدود حالات کے باوجود وہاں جتنے بھی کشمیری مجاہد خفیہ طور پر کام کر رہے تھے انہوں نے ہر قسم کا چھوٹا اسلحہ اور دوسرا کمانڈو مشن میں کام آنے والا سامان اپنی خفیہ کمیں گاہوں میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ دوسرا دن بھی میں نے اور کمانڈو اورنگ زیب نے شملے کے غیر آباد پہاڑی علاقے میں گھوم پھر کر گزار دیا۔ ہم شملے کے شہر کی آبادی سے دور رہنا چاہتے تھے۔

سورج غروب ہوتے ہی ہم واپس قبرستان والے کیمپ میں آکر شمس خواجہ کا انتظار کرنے لگے۔ وہ رات کے پہلے پہر آیا۔ ہم نے تابوتوں کے پاس موم بتی روشن کر رکھی تھی۔ وہ آکر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے تمہ کیا ہوا ایک کانڈ نکال کر کھولا اور اسے ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس کانڈ پر پنسل سے ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

”اورنگ زیب! یہ بریگیڈئیر شیا پر شاد کے بنگلے کا اندرونی نقشہ ہے۔ ہمارے خاص آدمی کی جو رشتے دار عورت بریگیڈئیر کے گھر میں کام کرتی ہے۔ میں خود اس کے گھر میں جا کر اسے ملا ہوں اور اس کی بتائی ہوئی معلومات کی روشنی میں میں نے خود یہ نقشہ تیار کیا ہے۔ یہ دیکھو۔ یہ بنگلے کے عقب کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی دروازہ نہیں ہے۔ بنگلے کے گرد کوئی بارہ فٹ اونچی پتھرلی دیوار ہے۔ یہاں باغ کا لان ہے۔ یہ تین کمرے جو تم دیکھ رہے ہو یہ تینوں بیڈ روم ہیں۔ ایک بیڈ روم میں بریگیڈئیر کمری اور اس کی بیوی سوتے ہیں۔

”یہ لوگ دادی میں پوری کمانڈو ٹریننگ لینے کے بعد عام کاری گروں اور مزدوروں کے ہمیں میں یہاں آکر کام کر رہے ہیں۔ تم کو ان کے بارے میں تشویش نہیں کرنی چاہیے۔ وہ بڑے ٹرینڈ کمانڈو ہیں“

وہ رات بھی ہم نے تابوتوں کی کوٹھڑی یا کیمپن میں ہی بسر کی۔ دوسرے دن رحیم کمانڈو صبح صبح پہنچ گیا۔ گٹھے ہوئے جسم کا سرخ و سپید کشمیری نوجوان تھا۔ ہم سے مصافحہ کیا تو میں نے اس کی گرفت کی سختی سے معلوم کر لیا کہ سخت جان ہے وہ اپنے ساتھ لکڑی کا ایک صندوق سر پر اٹھا کر لایا تھا۔ کہنے لگا۔

”سر! اس میں کمانڈو مشن کے لئے جس سازو سامان کی ضرورت ہے موجود ہے۔“
ہم نے بکس کو کھول کر دیکھا۔ اس میں کالے رنگ کی دو جریاں تھیں جن کے ساتھ اوئی نقاب لگے ہوئے تھے۔ یہ نقاب منہ پر چڑھانے کے بعد صرف آنکھوں اور ناک کی جگہ کے سوراخ ہی نظر آتے تھے۔ باقی سارا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا رہتا تھا۔ دو آٹو بیٹک چھوٹی شین گتیں تھیں۔ ایک ایک میگزین بیٹ تھی۔ شین گنوں کی ٹالیوں پر سائی لینسر چڑھے ہوئے تھے۔ دو سیاہ رنگ کے جاگر شوز تھے۔ آٹھ ہینڈ گرنیڈ اور ایک ایک سائی لینسر والا پستول بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہم نے شین گنوں کو چیک کیا۔ پستول دیکھے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”ہمیں ہینڈ گرنیڈوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ویسے تو پستول بھی کام نہیں آئیں گے صرف شین گتیں ہی کافی ہوں گی لیکن انہیں بھی بیٹ میں لگالیں گے ہو سکتا ہے ان کی ضرورت پڑ جائے۔“

پھر اورنگ زیب نے کمانڈو رحیم سے پوچھا۔

”کمانڈو کا جو اصلی نشان یعنی ٹریڈ مارک ہوتا ہے وہ کہاں ہے؟“

کمانڈو رحیم نے مسکراتے ہوئے بکس میں ہاتھ ڈال کر ایک تھیلا نکال کر ہمیں دیا۔ اس تھیلے میں دو کمانڈو چاقو تھے۔ اورنگ زیب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کمانڈو چاقوؤں کو باری باری چوم کر کہا۔

کوٹھی کبھی دیکھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں دن کے وقت اسے ایک نظر دور سے ہی دیکھ لوں“

شمس خواجہ بولا۔

”میں کوٹھی دکھانے نہیں جاسکتا۔ یہ کام کمانڈو رحیم کرے گا۔ وہ صبح کسی وقت تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر کوٹھی دکھا دے گا۔ تم بتاؤ۔ تمہارا پروگرام کیا ہے؟“
کمانڈو اورنگ زیب نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”ہم کل رات انیک کریں گے۔ کمانڈو رحیم سے کہو کہ ہمیں دن میں کسی وقت بریگیڈنیری کوٹھی دکھا دے۔ وہ کس وقت یہاں آسکتا ہے؟“
شمس کہنے لگا۔

”یہ اس کا چھوٹا سا گودام ہے۔ یہاں وہ تابوت بنا کر رکھتا ہے۔ میں اسے صبح ہی بھیج دوں گا۔“

”ٹھیک ہے“

اورنگ زیب بولا۔

”اور کل شام تک ہمیں ہماری کمانڈو ایکشن کی دوسری چیزیں بھی پہنچ جانی چاہئیں۔ جن میں کلوروفارم کی کیشی بہت ضروری ہے“
شمس بولا۔

”یہ ڈیوٹی کمانڈو رحیم کی ہے۔ وہ یہ ساری چیزیں شام ہونے سے پہلے پہلے یہاں لے آئے گا۔ رات کو کمانڈو رحیم ویگن کے ساتھ اپنے دو مجاہد کمانڈو ساتھیوں کے ساتھ بھی ڈکی والے موڑ پر موجود ہو گا۔“

اس کے بعد ہماری میننگ ختم ہو گئی۔ شمس خواجہ چلا گیا۔ رات گئے تھے ہم اپنے مشن کی تفصیلات طے کرتے رہے۔ ہمیں اس مشن کے سلسلے میں کافی حد تک اس علاقے میں مقیم خفیہ کمانڈو مجاہدوں کی کارکردگی پر بھروسہ کرنا پڑ رہا تھا۔ میرے استفسار پر کہ کیا یہ لوگ پوری مہارت سے یہ فرض پورا کر سکیں گے، کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

اور بریگیڈیئر کے جنگلے کی طرف سے تمہیں فوجی اسلحے اور مشین گنوں کی فائرنگ سنائی دی تو تم بے شک چلے جانا ہم اپنا بچاؤ کرنا جانتے ہیں۔“
”او کے سرا“

”اس بکس کو میں کونے میں رکھ دیتا ہوں۔ اب آپ دونوں میں سے کوئی ایک میرے ساتھ چلے تاکہ میں بریگیڈیئر شیاپا پر شاد کی کوٹھی دکھا دوں کوٹھی کے گرد دن رات دو فوجی گشت لگا کر پہرے پر موجود ہوتے ہیں۔ آپ کو کوٹھی دور سے دیکھنی ہوگی۔“
کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں“

پھر اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”تم ہمیں ٹھہرو گے۔“

میں نے کہا۔

”نو پرابلم!“

کمانڈو اورنگ زیب کمانڈو رحیم کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ لکڑی کے خالی تابوت پر بیٹھ گیا۔ موم بتی فرش پر رکھے پتھر پر جل رہی تھی۔ ابھی دن کے آٹھ بجے تھے۔ باہر دھند پھیلی ہوئی تھی اور آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ رات کو بارش شروع ہو جائے۔ بارش ہمارے کمانڈو مشن کا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ بلکہ سردیوں کی بارش کمانڈو ایکشن کے لئے مفید ہوتی ہے۔ سردی اور بارش کی وجہ سے راستہ عام طور پر صاف ملتا ہے اور یہاں بھی ممکن تھا کہ اگر رات کو بارش ہونے لگی تو انڈین فوجی جو رات کو بریگیڈیئر کی کوٹھی کی دیوار کے گرد چل پھر کر پہرے پر ہوتے ہیں بارش کی وجہ سے کسی جگہ بارش سے بچنے کے لئے بیٹھ جائیں۔ ان کی یہ غفلت ہمارے حق میں فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے کونے میں جا کر لکڑی کے بکس کو کھولا اور ایک بار پھر مشین گنوں کو چیک کیا۔ یہ فوجی مشین گنیں تھیں جو ہمارے کشمیری مجاہدوں نے کسی بھارتی فوجی کانوائے پر کامیاب

”انشاء اللہ! ہم اپنے مشن میں کامیاب ہوں گے۔“

پھر اس نے کلوروفارم کے بارے میں پوچھا۔ کمانڈو رحیم نے اپنی جیب میں رد مال میں لپٹی ہوئی ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر دی اور کہا۔

”سرا اس میں اتنا کلوروفارم ہے کہ اس سے بریگیڈیئر شیاپا پر شاد مکرچی کے سارے خاندان کو بے ہوش کرنے کے بعد بھی بچ جائے گا۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے شیشی کو موم بتی کی روشنی میں کر کے غور سے دیکھا۔ پھر اسے ناک سے تھوڑی دور رکھ کر تھوڑا سا سونگھا اور ناک سیڑ کر بولا۔

”بالکل صحیح ہے۔“

میں نے کمانڈو رحیم سے کہا۔

”دوست! ہم آج رات اپنے مشن پر روانہ ہوں گے۔ تمہیں اپنے دو کمانڈو ساتھیوں کے ہمراہ ڈگی والی سڑک کے موڑ پر ویگن لے کر ہر حالت میں موجود رہنا چاہیے۔“

کمانڈو رحیم بولا۔

”سرا آپ ہمیں وہاں موجود پائیں گے۔ لیکن اگر وہاں کوئی ناخوشگوار ایمر جنسی ہو گئی اور فائرنگ ہونے لگی اور شور مچ گیا تو ہم وہاں سے فرار ہو جائیں گے۔ پھر آپ اپنے طور پر وہاں سے نکلنا ہو گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم آپ کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر خدا نخواستہ آپ کے ساتھ فوج نے ہمیں بھی پکڑ تو وہ ہمارے چہرے دیکھ لیں گے اور اس طرح شیلے کے علاقے میں مقیم اور آزادی کے مقصد کے لئے خفیہ کام کرنے والے سارے مجاہدین کو ایک دم روپوش ہونا پڑے۔ اور اس سے ہمارے دور رس مقاصد کو شدید خطرہ پیدا ہو جائے گا اور سارا کام رائے ہو جائے گا۔ کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں؟“

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”تمہیں صرف فائرنگ کی آوازوں پر وہاں سے نہیں جانا ہو گا۔ ہاں اگر شور مچے

بولا۔

”ایک کنال کا آدھا کرلو۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ایک بار ہم کوٹھی کے اندر کود گئے تو پھر چاہے جتنا فاصلہ ہو۔ ہم ٹارگٹ پر پہنچ جائیں گے۔“

میں نے کہا۔

”ہمیں بے ہوش لڑکی کو بھی واپسی پر دیوار کے اوپر سے دوسری طرف لانا ہوگا۔“

”سب ہو جائے گا۔ بس تم تیار ہو جاؤ آج رات ہم انیک کریں گے۔ ہماری یہی کوشش ہوگی کہ ہمارا مشن کامیاب ہو۔ آگے اللہ مالک ہے۔“

دوپہر کے وقت کمانڈو رحیم ہمارے لئے کچھ روٹیاں اور بھنا ہوا گوشت لے کر آیا۔ اس نے بتایا کہ قبرستان والے تمہ خاں نے چارپائی ڈال کر لڑکی کے لئے سونے کا سارا انتظام کر دیا گیا ہے۔ اورنگ زیب بولا۔

”اگر اسے نیند آگئی تو۔“

کمانڈو رحیم بولا۔

”سرا نیند تو کہتے ہیں سولی پر بھی آجاتی ہے۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے وگین کے بارے میں پوچھا۔

”وگین کے انجن کو اچھی طرح چیک کر لینا۔ سے سلف شارٹ ہونا چاہئے۔ اگر عین موقع پر وہ شارٹ نہ ہوئی تو ہم مصیبت میں پھنس سکتے ہیں“

کمانڈو رحیم نے کہا۔

”سرا میرے دونوں کمانڈو ساتھی صبح سے وگین کی صفائی میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ

کو بریگیڈیئر مگر جی کے بنگلے سے جو پہاڑی اترائی ڈگی والی سڑک پر آتی ہے اس کا راستہ

معلوم ہے ناں؟“

”معلوم ہے۔ فکر نہیں۔“

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد کمانڈو رحیم یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ رات دس بجے کے بعد ہی

وگین سمیت ڈگی والے موڑ کے درختوں میں پہنچ جائے گا۔ ہم نے تھوڑا بہت کھانا کھایا۔

انیک کرنے کے بعد ان سے چھینی تھیں۔ پستول بھی جدید قسم کے تھے۔ میں نے انیس موم بتی کی روشنی میں لا کر غور سے دیکھا۔ ان پر دستے کے پاس دو حرف اسرائیلی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ یہ وہ اسلحہ تھا جو مسلمانوں کا اول دشمن اسرائیل بھارت کو کشمیر میں مجاہدوں کی آزادی کی تحریک کو کچلنے کی خاطر سپلائی کر رہا تھا۔ یہ پستول بھی ملٹری کے تھے اور انڈین فوجیوں سے چھینے ہوئے تھے۔ میں نے میگزین کی بیلیٹیں بھی چیک کیں۔ یہ کافی اسلحہ تھا۔ اگرچہ میرے خیال کے مطابق ہمیں اس کی ضرورت نہیں پڑنے والی تھی۔ ہمارے لئے کافی تھے۔ کمانڈو کے پاس اس کا چاقو ہو اور وہ پوری طرح تربیت یافتہ ہو تو وہ موافق ماحول میں پوری پلٹن کا اس ایک چاقو سے صفایا کر سکتا ہے۔ میں نے بکس بند کیا اور تابوت کے اوپر لیٹ کر اورنگ زیب کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد باہر چھوٹے پتھروں پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ درز میں سے دیکھا۔ اورنگ زیب اکیلا چلا آ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آکر بولا۔

”کوٹھی کی ساری لوکیشن دیکھ آیا ہوں کوٹھی کے ارد گرد اونچی دیوار ہے۔ گیارہ بارہ فٹ ہوگی۔ دور سے دیکھی ہے۔ یہ دیوار پر اہل بن سکتی تھی۔ مگر اس کا بھی انتظام کر لیا ہے۔“

اس نے جیکٹ کی جیب میں سے نائیلون کی باریک مگر بڑی مضبوط رسی نکال کر مجھے دکھائی۔ میں نے اسے کھینچ کر دیکھا۔ بہت مضبوط تھی۔ اس میں دو دو فٹ کے فاصلے پر گانٹھیں لگی تھیں۔ کہنے لگا۔

”ہم دیوار میں رات کو کیل نہیں ٹھونک سکتے۔ اس سے آواز پیدا ہوگی گاڑڈ چوکنی ہو جائے گی۔ اس رسی کے ذریعے ہم دیوار پھاند لیں گے۔“

میں نے پوچھا۔

”کوٹھی کے عقبی دیوار سے ار ملا کے بیڈ روم کا غسل خانہ کتنی دور ہوگا؟“

اورنگ زیب بیٹھ گیا اور رسی کو جوڑ کر تمہ کرنے لگا۔

چڑھائے کہ ہمارے صرف چہرے نظر آرہے تھے۔ کمانڈو چاقو اپنی اپنی ہیلت میں لگا لئے۔
آٹومیک پستولوں کے سائی لینسر کھول کر دوبارہ فٹ کئے۔ چھوٹی خود کار شین گنیں
سنگوں کے ساتھ کمر کے پیچھے کر لیں۔

کمانڈو اورنگ زیب کئے لگا۔

”شین گن کا استعمال ہم انتہائی ضرورت کے وقت کریں گے۔ کمانڈو چاقو کو ترجیح
دیں گے۔ اس کے بعد موقع دیکھ کر پستول استعمال کریں گے۔“

ہم نے دو دو ہینڈ گرنیڈ اپنی جیکٹوں کی جیبوں میں رکھ لئے۔ کلوروفارم کی چھوٹی
شیشی اور رومال اورنگ زیب نے اپنے پاس ہی رکھا۔ دیوار پھلانگنے والی ٹائیلوں کی
باریک رسی بھی اس کے پاس تھی۔ جب ہم پوری طرح کمانڈو بن گئے تو اورنگ زیب نے
موم بتی کی روشنی میں اپنی کلائی کی گھڑی دیکھ کر مجھ سے کہا۔

”اپنی گھڑی کا وقت بولو“

میں نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔

دس بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں“

اس نے کہا۔

”چیک۔ ٹھیک ہے“

وہ دروازے کے پاس گیا۔ اس نے چٹخنی ہٹا کر دروازے کو کھولا اور باہر جھانک کر
دیکھا۔ پستول اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے ہوئے
تھے۔ وہ گردن دروازے سے باہر نکالے دیکھ رہا تھا اور کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر
میری طرف دیکھ کر بولا۔

”اوکے۔ بکس کونے میں چھپا دو اور موم بتی بجھا کر آجاؤ“

میں نے کمانڈو کے سامان والا بکس کونے میں لے جا کر رکھ دیا۔ وہ بالکل خالی تھا۔
موم بتی پھونک مار کر بجھائی تو کوٹھڑی میں اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرا چھاتے ہی دروازے کے
باہر ابر آلود رات کی پھپکی پھپکی دھندلی سی روشنی میں مجھے کمانڈو اورنگ زیب دروازے

اور کمانڈو بکس کھول کر اسلحہ نکالا اور اس کی صفائی وغیرہ میں مصروف ہو گئے۔ دوپہر کے
تین بج رہے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے مجھے کہا۔

”تم تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤ ہمیں کم از کم دو دو گھنٹے ضرور آرام کرنا چاہیے۔“

آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ہوشنگ آباد کے جنگلوں میں مجاہد کمانڈو کی سخت کمانڈو
ٹریننگ نے مجھے نیند پر قابو پانا بھی سکھا دیا تھا اور میں کم از کم دو راتیں بغیر آنکھیں جھپکے
گزار سکتا تھا۔ لیکن اورنگ زیب کے کہنے پر میں ایک تابوت کے اوپر لیٹ کر سو گیا۔ دو گھنٹے بعد میں نے
ٹھیک دو گھنٹے کے بعد اس نے مجھے جگا دیا اور خود وہیں لیٹ کر سو گیا۔ دو گھنٹے بعد میں نے
اسے جگا دیا۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے تابوتوں والی کوٹھڑی سے باہر نکل آئے۔ رات کا پہلا
پہر شروع ہو گیا تھا۔ درختوں پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ آسمان پر بادل جھکے ہوئے تھے۔ ہم
اخروٹ کے ایک بہت بڑے درخت کے پیچھے کھڑے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

”سردی بڑھ گئی ہے۔ اگر رات کو بارش ہونے لگے تو ہمیں ٹارگٹ مارنے میں

آسانی ہوگی۔ بارش اور سردی میں گشت لگانے والے انڈین فوجی غافل ہو سکتے ہیں“

کچھ دیر تک ہم کھلی فضا میں اخروٹ کے درخت کے نیچے بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں
کرتے رہے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”اگر وہاں معاملہ الٹ گیا اور ہم میں سے کوئی دشمن کی فائرنگ سے مر گیا تو ہمیں
لاش کو نہیں اٹھانا ہوگا۔ بلکہ لاش کو وہیں چھوڑ کر اپنے مشن کو کامیاب بنانے کی کوشش
کرنی ہوگی لاش ہم میں سے کسی کے لئے بھی مصیبت کا باعث بن سکتی ہے۔“

ہمیں رات کے ٹھیک گیارہ بجے تابوتوں والے کیمپن سے اپنے مشن پر روانہ ہو
تھا۔ دس بجے ہم کیمپن میں بیٹھے اسلحہ وغیرہ کو آخری بار چیک کر رہے تھے۔

پورے ساڑھے دس بجے ہم نے اپنے کمانڈو آپریشن کی تیاریاں شروع کر دیں
سب سے پہلے ہم نے اپنی گھڑیاں ملائیں۔ اس کے بعد کالے جوگر شوز پہنے۔ نیلی جینز
نے پہلے ہی پمن رکھی تھیں۔ جیکٹیں اتار کر نیچے کالی جریاں پہنیں۔ اوپر دوبارہ جیکٹیں
پمن کر ان کے زپ گردن تک لگا لئے۔ جرسیوں کے ہڈ آدھے سروں پر اس طرح او

کے ساتھ بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔
 ”ہم اس وقت کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف کھڑے ہیں۔ وہ روشندان کی روشنی
 اراٹھ کمری کے ہاتھ روم کے بلب کی ہے۔ ہم اس طرف سے دیوار پھاند کر اندر جائیں
 گے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو درخت ہیں۔ ان کی شاخیں دیوار کے اوپر جھکی
 ہوئی تھیں۔ بریگیڈیئر نے سیکورٹی کے پیش نظر انہیں کٹوا دیا ہے۔ ہم درختوں کے قریب
 سے دیوار پھاندیں گے اوکے؟“

میں نے کہا۔

”اوکے!“

”کم اون“

ہم ڈھلان اتر گئے۔ تیس چالیس قدموں کے فاصلے پر سامنے بریگیڈیئر کی کوٹھی کی
 دیوار شروع ہو جاتی تھی۔ ہم ایک جگہ جھانڈیوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ اورنگ زیب بولا۔
 ”گارڈ ڈیوٹی کے فوجیوں کو ختم کرنا ہو گا۔ ان کی موجودگی میں ہمارا مشن کامیاب
 نہیں ہو سکتا۔“
 میں نے آہستہ سے کہا۔

”یہ فوجی پوری دیوار کے گرد چل کر پہرہ دیتے ہیں۔ اگر ہم نے انہیں ختم کر دیا تو
 گیٹ پر موجود گارڈ کو شک پڑ سکتا ہے کہ دونوں فوجی ابھی تک چکر پورا کرنے کے بعد
 واپس کیوں نہیں آئے۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے آہستہ سے کہا۔

”میں نے کمانڈو رحیم سے ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ یہ دونوں فوجی ڈوگرہ
 ہیں۔ وہ پوری دیوار کا چکر نہیں لگاتے۔ وہ صرف دیوار کے اس طرف نصف دائرے میں
 گشت لگاتے ہیں دیوار کے دوسرے نصف حصے کو گیٹ کی پوسٹ پر جو فوجی ہیں وہ چیک
 کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ہم دونوں فوجیوں کو ختم کر دیں گے تو گیٹ کی پوسٹ پر
 فوجیوں کو ان کے انجام کی صبح تک خبر نہیں ہوگی۔“

کے پاس کھڑا نظر آیا۔ میں نے بھی آٹو مینک پستول اپنے دونوں ہاتھوں میں اس طرح
 مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے باہر دشمن گھات لگائے بیٹھا ہو اور ہمیں اس کے درمیان
 سے چھپ کر گزرنا ہو۔ کمانڈو ایکشن جب شروع ہوتا ہے تو ایک تربیت یافتہ کمانڈو یہی
 سمجھتا ہے کہ اسے دشمنوں کے درمیان سے اس طرح گزرنا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ
 ہو۔

باہر آتے ہی اورنگ زیب نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ سرگوشی میں بولا۔
 ”میرے پیچھے پیچھے آؤ“

ہم نے پستول جیکٹ کی جب میں ڈال لئے تھے۔ کیبن سے نکلتے ہی اورنگ زیب
 پیچھے نشیب کی اترائی اترنے لگا میں اس کے پیچھے تھا۔ نشیب ختم ہونے کے ساتھ ہی ہم
 دوسری طرف والی چڑھائی چڑھ کر درختوں میں سے گزرنے لگے۔ میں نے پیچھے گردن گھا
 کر دیکھا۔ پیچھے پہاڑیوں کے اوپر اور نشیب میں شملے کی عمارتوں کی روشنیاں جھلما رہی
 تھیں۔ ہم درختوں میں کافی دور تک ادھر ادھر دوڑتے چلے گئے۔ اورنگ زیب شارٹ
 کٹ راستے سے بریگیڈیئر شیلما پر شاد کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ان سارے رستوں
 سے اچھی طرح واقف تھا۔ پندرہ بیس منٹ تک پہاڑی پگ ڈنڈیوں پر چلتے رہنے کے ہم
 ایک اونچی جگہ پر آکر رک گئے۔
 کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”وہ کونے والی کوٹھی بریگیڈیئر کمری کی ہے۔“

نیچے ڈھلان تھی۔ آگے کچھ فاصلے پر ایک کوٹھی میں کہیں کہیں روشنی نظر آرہی
 تھی۔ اورنگ زیب نے ایک روشنی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ کوٹھی کے گیٹ کی بتی ہے۔ وہاں فوجی گارڈز ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ تمہیں
 کوٹھی کی دیوار نظر آرہی ہے نا؟“

”ہاں۔ میں دیکھ رہا ہوں“

کوٹھی کی دیوار کہیں کہیں درختوں میں چھپی ہوئی تھی۔ دیوار پر کہیں کہیں کھبوں

ہو گا۔ پسلا دار ہی کاری ہونا چاہئے۔ اس کی ہلکی سی آواز بھی نہ نکلے۔“

میں نے اورنگ زیب کو کوئی جواب نہ دیا اور اندھیرے میں جھک کر دوڑتا ہوا سامنے دیوار کے قریب والی جھاڑیوں میں گھس کر بچوں کے بل بیٹھ گیا۔ رات خاموش تھی۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمیں ایک وقت پر بجلی کی طرح دونوں فوجیوں پر انیک کرنا ہو گا۔ یہ بڑی مہارت کا کام تھا۔ بڑی تجربہ کاری کا کام تھا اور مجھے خاص طور پر اس وقت کے لئے کمانڈو ٹریننگ دی گئی تھی۔ اور اس وقت مجھے اپنے آپ پر بھوکے شیر کا گمان ہو رہا تھا جس نے اپنے شکار پر مکمل رازداری اور خاموشی کے ساتھ بے آواز جست لگا کر اس کی گردن کو اس طرح دبوچ لیتا تھا کہ آواز تک پیدا نہ ہو۔ مجھے یقین تھا کہ کمانڈو اورنگ زیب پر بھی ایسی ہی کیفیت طاری تھی اور وہ بھی اسی طرح محسوس کر رہا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ ایک بڑا اچھا تربیت یافتہ پورے ڈسپلن والا کشمیری کمانڈو تھا۔

سب سے پہلے مجھے اس طرف سے باتیں کرنے اور کسی کے آہستہ سے ہنسنے کی آواز آئی جس طرف دونوں ڈوگرے فوجی گئے تھے۔ وہ آگے جا کر دیوار کی گشت کا نصف دائرہ مکمل کرنے کے بعد واپس آرہے تھے۔ ادھر دیوار پر کچھ دور بلب روشن تھا۔ دونوں فوجی روشنی میں نظر آگئے۔ وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے آہستہ آہستہ بڑی بے فکری سے چلے آرہے تھے۔ ان کے درمیان بمشکل آدھے گز کا فاصلہ تھا۔ دیوار والی روشنی سے نکل کر وہ آہستہ آہستہ میری جانب اندھیرے میں آتے جا رہے تھے۔ میں نے اپنی طرف والے فوجی کو اپنی ریخ میں لے لیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ کس وقت اور کس زاویے پر مجھے اس پر انیک کرنا ہے۔ اسی طرح یقیناً کمانڈو اورنگ زیب نے بھی اپنے والی فوجی کو نشست میں لے لیا تھا۔

یہ بڑی نازک گھڑی تھی۔ یہ وقت ایک تجربہ کار کمانڈو کی ساری تربیت اور سارے تجربے کے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ ذرا سی کمزوری ذرا سی بھول چوک اسے نہ صرف اپنے اہم مشن کی ناکامی بلکہ اسے موت سے ہمکنار کرا سکتی ہے۔ اس لمحے میری حالت یہ

اورنگ زیب نے آہستہ سے شی کہہ کر مجھے آگے سے نہ بولنے کی ہدایت کی اور دھیمی سرگوشی میں بولا۔

”گارڈز آرہے ہیں“

ہمیں دیوار جہاں خم کھاتی تھی ادھر سے اندھیرے سے دو انسانی سائے نکل کر دیوار کے ساتھ ساتھ آتے دکھائی دیئے۔ وہ بڑی بے تکلفی سے چلے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک سپاہی سگریٹ پی رہا تھا۔ اندھیرے میں اس نے کش لگایا تو اس کے سگریٹ کا گل نقطے کی طرح روشن ہو گیا۔ ہم گھات میں بیٹھے بڑے غور سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ہم نے جرسی کے سیاہ نقاب اپنے چہروں پر کھینچ لئے تھے۔ اب صرف ہماری آنکھیں اور ناک ہی قریب سے دیکھے جاسکتے تھے۔ دونوں فوجی دیوار کے قریب سے آہستہ آہستہ گزر گئے۔ وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔ ان کی باتوں کی ہلکی ہلکی آواز ہمیں آئی تھی۔ ذرا آگے دیوار پر ایک بلب روشن تھا۔ وہ اس کی روشنی میں سے گزرے تو ہمیں ان کے کندھوں سے لٹکی ہوئی شین گتیں نظر آئیں۔ جب وہ دیوار کے خم کے ساتھ آگے نکل گئے جہاں وہ اندھیرے میں گم ہو گئے تو کمانڈو اورنگ زیب نے آہستہ سے کہا۔

”ان دونوں کو ختم کرنا ضروری ہے اس وقت تو یہ ہمیں نظر آرہے ہیں لیکن واپسی پر جب ہم بے ہوش لڑکی کو اٹھا کر دیوار کی دوسری طرف ہوں گے تو ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو گا کہ یہ دیوار کے نیچے سے گزر رہے ہیں یا نہیں‘ تب یہ دونوں ہمارے لئے مصیبت بن سکتے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔“

ہم جھاڑیوں اور اونچی گھاس والی ڈھلان تیزی سے اتر کر کوٹھی کی دیوار سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک درخت کے پیچھے گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ ہم نے اپنے اپنے کمانڈو چاقو نکال کر اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”تم سامنے دیوار کے نیچے والی بھاڑی میں جا کر چھپ جاؤ۔ تم اپنی طرف والے ڈوگرے کو ختم کرو گے۔ میں اس طرف والے کو ختم کروں گا۔ خبردار۔ وار گردن پر کرنا

آپس میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ ساری باتیں اشاروں میں ہی ہو رہی تھیں، اورنگ زیب نے سامنے کچھ فاصلے پر کونٹھی کے ایک کمرے کے روشندان کی روشنی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ بریگیڈیئر شیا پر شاد مکرچی کی بیٹی ارملہ مکرچی کے بیڈ روم کے غسل خانے کی روشنی تھی۔ ہم جھک کر جتنی تیز دوڑ سکتے تھے دوڑ کر اس روشنی کے نیچے آتے ہی بیٹھ گئے۔

اورنگ زیب نے انگلی سے اوپر کی جانب اشارہ کیا۔ وہ ارملہ کے ہاتھ روم کی کھڑکی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ جس کے بارے میں کمائڈو رحیم نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ ان کی خاص نوکرانی رات کو جاتی دفعہ اس کھڑکی کی چٹنی اندر سے کھول جائے گی۔ یہ بڑی نازک اور حساس کی گھڑی تھی۔ خدا نخواستہ اگر نوکرانی چٹنی کھولنا بھول گئی ہو تو پھر ہمیں اپنی ساری حکمت عملی کو بدل کر کسی دوسرے فوری منصوبے پر عمل کرنا تھا۔ جو اس قسم کے حالات میں سازگار بھی ہو سکتا تھا اور انتہائی خطرناک نتائج کا حامل بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ کھڑکی کے ایک پٹ پر ڈالا۔ کھڑکی کا پٹ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اس آواز پر اورنگ زیب نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ہم تین سیکنڈ تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اورنگ زیب نے اشارہ کیا۔ اور وہ کھڑکی میں سے ہاتھ روم میں گھس گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی کھڑکی کے راستے ہاتھ روم میں گھس گیا۔ یہ بڑا ماڈرن قسم کا غسل خانہ تھا۔ بینگنوں پر رنگین تولیے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک شیشے کی الماری میں زنانہ لباس اور ساڑھیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ سنک کے اوپر بیضوی آئینہ لگا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ سرسری نظر سے دیکھ لیا تھا۔ اس دوران کمائڈو اورنگ زیب ہاتھ روم کے دروازے کے پاس جا کر اس کی گول ہتھلی کو بڑے آرام سے گھما رہا تھا۔ دروازہ بے آواز تھا۔ دروازے کا ایک ہی پٹ تھا۔ اورنگ زیب نے غسل خانے کی تکی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جلدی سے اس کا سوچ آف کر دیا۔ ہاتھ روم میں اندھیرا بھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کمائڈو اورنگ زیب نے آہستہ سے دروازہ تھوڑا سا کھولا تو بیڈ روم کی روشنی کی لکیر اندر آنے لگی۔ تھوڑے سے کھلے دروازے میں سے اورنگ زیب

تھی کہ مجھے سوائے اپنی طرف والے ڈوگرہ فوجی کی گردن کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ گردن مجھے اندھیرے میں بھی نظر آ رہی تھی۔ گردن اندھیرے میں میرے قریب آتی رہی تھی۔ جب وہ اس جھاڑی کے قریب آئی جہاں میں بچوں کے بل بالکل تیار بیٹھا تھا مجھے معلوم تھا کہ جس وقت میں حملہ آور ہوں گا اس وقت کمائڈو اورنگ زیب کا بڑا چاقو دوسرے فوجی کی گردن میں اتر چکا ہو گا۔ دونوں فوجی ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے جھڑپ کرتے جب میری جھاڑی کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک قدم آگے نکلے تو میر نے چھتے کی طرح اپنے والے فوجی پر چھلانگ لگا دی۔ چھلانگ لگانا اور بڑے کمائڈو چاقو پورا پھل ڈوگرے فوجی کی گردن میں اتارنا یہ دو عمل، دو فعل نہیں تھے۔ یہ ایک ہی عمل اور ایک ہی فعل تھا۔ جب میں نے نیچے گرے ہوئے فوجی کی گردن سے چاقو کھینچ کر باہر نکالا تو دیکھا کہ کمائڈو اورنگ زیب دوسرے فوجی کے اوپر بیٹھا اس کی جیکٹ سے اپنے چاقو پر لگے ہوئے خون کو صاف کر رہا تھا۔ اس نے اندھیرے میں مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں فوجیوں کی لاشوں کو ٹانگوں سے پکڑا اور انہیں گھسیٹتے ہوئے اوپر جھاڑیوں کے پیچ ڈال دیا۔ کمائڈو اورنگ زیب نے جیب سے نائیلون کی رسی نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی تھی وہ مجھے اشارہ دے کر دوڑ کر دیوار کے پاس آگیا۔ اس نے مجھے دیوار کے ساتھ بیٹھنے اشارہ کیا۔ سارا پروگرام سارا عمل، سارا ایکشن پہلے سے طے شدہ تھا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ اورنگ زیب میرے کندھے پر چڑھ گیا۔ میں آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کمائڈو اورنگ زیب دیوار کے اوپر چڑھ گیا تھا۔ اس نے نائیلون کی رسی دیوار پر اس طرح ڈال دی کہ وہ آدمی میری جانب اور آدمی دیوار کی دوسری جانب لٹکنے لگی۔ میں نے اپنی طرف والی رسی کا سرا مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کمائڈو اورنگ زیب رسی کو پکڑ کر دیوار کی دوسری طرف اتر گیا۔ دوسری طرف جاتے ہی اس نے رسی کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اس نے دوسری طرف سے رسی کو پکڑ رکھا تھا۔ میں رسی کی مدد سے دیوار کے اوپر آیا اور دوسری طرف کود گیا۔ رسی کو ہم نے اسی طرح دیوار پر ہی رہنے دیا۔ ہم اندھیرے میں دیوار کے بالکل ساتھ لگ گئے۔ کمائڈو چاقو ہمارے ہاتھوں میں ہی تھے۔ اس وقت

نے دوسری طرف ایک نگاہ ڈالی۔ پھر پیچھے ہٹ کر مجھے اشارہ کیا۔ میں نے آگے ہو کر دروازے کی لمبی درز میں سے جھانک کر دیکھا۔

ایک بڑے قیمتی سازو سامان سے سجا ہوا بیڈ روم تھا۔ پلنگ پر ایک لڑکی اپنے سیاہ بالوں کو ریشمی تکیوں پر پیچھے کی طرف ڈالے گہری نیند سو رہی تھی۔ قریب ہی تپائی پر نیل لیپ روشن تھا۔ دو چار کتابیں اور پلیٹ میں ایک شیشے کا خالی گلاس پڑا تھا۔ ہم نے بڑے روم میں جا کر جو کچھ کرنا تھا وہ سب کچھ پہلے سے آپس میں طے کر رکھا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ذرا سا پیچھے کیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے سیدھے ہاتھ میں کلوروفارم کی شیشی اور رومال تھا۔ اس نے شیشی میں سے کلوروفارم کے دس بارہ قطرے رومال میں ڈال کر اسے بھگو کر اپنے ہاتھ کی مٹھی میں تھام کر شیشی جیب میں رکھی اور میرے کان کے پاس منہ لاکر سرگوشی میں کہا۔

”ایکشن صرف دس سیکنڈ کا ہے“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازے سے پیچھے ہٹ گیا۔ سب سے پہلے کمانڈو اورنگ زیب بیڈ روم میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میں اندر چلا آیا۔ دروازہ بے آواز تھا۔ میں نے پروگرام کے مطابق دروازے کو آدھے سے زیادہ کھول دیا تھا۔ ہم دونوں دبے پاؤں اس طرح بریگیڈیئر شیلما پرشاد کی بیٹی ارملاکرچی کے پلنگ کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے نیا گرا آبشار کے اوپر لوہے کا تار تار ہوا ہو اور ہم اس کے اوپر چل رہے ہوں۔ ارملاکا جسم گردن تک زرد اور سبز دھاریوں والے ریشمی کبل میں چھپا ہوا تھا۔ کمرے کی فضا گرم تھی۔ لگتا تھا کہ بیڈ روم میں کافی دیر تک بجلی کا بیٹر چلتا رہا ہے۔ سونے سے پہلے اوف کر دیا گیا ہے۔ ہم اوپر سے ہو کر ارملاکے پلنگ کے سرانے کی جانب آگئے سانولے رنگ کی بنگالی لڑکی ارملابے فکر ہو کر سو رہی تھی۔

کمانڈو اورنگ زیب نے اپنا کلوروفارم والا ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے ”آنا“ لڑکی کو گردن پر سے اس طرح دبوچ لیا کہ میرا ایک ہاتھ اس کی گردن اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر تھا۔ ارملابڑبڑا کر جاگ پڑی تھی۔ اس نے ایک چیخ مڑا

ہاری تھی جو اس کے حلق کے اندر رہی تھی۔ باہر نہیں نکل سکی تھی۔ میں نے اس چیخ کی رزش اور سنناٹ اپنے ہاتھوں میں محسوس کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈو اورنگ زیب نے کلوروفارم کے رومال والا ہاتھ ارملاکے ناک پر رکھ کر دبایا۔ میں نے ارملاکے منہ پر رکھے ہوئے ہاتھ کا دباؤ تھوڑا سا کم کر دیا۔ ارملانے تڑپ کر دو تین گہرے سانس لئے۔ وہ پٹھی پٹھی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی اور اس کے بعد اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں نے جلدی سے جیب میں سے سکاچ ٹیپ نکال کر ارملاکے منہ پر چسپاں کر دی۔ یہ سکاچ ٹیپ کافی چوڑی اور مضبوط تھی اور ارملابے ہوش میں آنے کے بعد بھی منہ سے کوئی آواز نہیں نکال سکتی تھی۔ ہم نے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے اس کی کلاںیاں ریشمی رومال سے اچھی طرح باندھ دیں۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈو اورنگ زیب نے بے ہوش لڑکی کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور ہم تیز قدم اٹھاتے ہاتھ روم میں آگئے۔ میں ہاتھ روم کی کھڑکی سے باہر کود گیا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے بے ہوش ارملاکو کھڑکی سے باہر میرے حوالے کیا اور خود بھی کھڑکی میں سے باہر آگیا۔ ارملابڑی نازک اندام دہلی پتلی سی بنگالی لڑکی تھی اس کا کوئی خاص وزن نہیں تھا۔ میں نے اسے اپنے کاندھے پر ڈال رکھا تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب جھک کر کوٹھی کی دیوار کی طرف دوڑ کر گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے جتنی تیز چل سکتا تھا چلتا ہوا دیوار کے نیچے آگیا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے مجھے خاص اشارہ کیا۔ میں نے بے ہوش لڑکی کو وہیں دیوار کے ساتھ گھاس پر ڈال دیا۔ دیوار پر لگی ہوئی رسی کا ایک سرا اورنگ زیب کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں اس کے کاندھوں پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اورنگ زیب اٹھ کھڑا ہوا۔ میں دیوار کے اوپر پہنچتے ہی لیٹ گیا اور اندھیرے میں چہرہ اٹھا کر دوسری طرف کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ جن فوجیوں کو وہاں سے گزرنا تھا اور جن کے گزرنے کا اندیشہ تھا ان کی لاشیں دور جھاڑیوں کے پاس پڑی تھیں۔ میں دیوار کی دوسری جانب اتر گیا۔ اس دوران اورنگ زیب نے رسی کو پکڑے رکھا۔ اب میں نے رسی کو مضبوطی سے اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر اس طرح پکڑ لیا جس طرح رسہ کشی کے

زیب نے رسی دیوار کے اوپر سے کھینچ کر جیکٹ کی جیب میں ڈالی۔ بے ہوش لڑکی، بازو پکڑ کر اپنی گردن کے گرد ڈالا اور پھر ایک ہلکے سے جھٹکے سے اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور ہم تیزی سے اوپر جھاڑیوں اور درختوں کی طرف دوڑ پڑے۔ تھوڑی سی چڑھائی تھی۔ آگے ہموار جگہ تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب آگے آگے تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم رات کے اندھیرے میں جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے جس قدر تیزی سے گزر سکتے تھے گزر رہے تھے۔ آگے ایک چھوٹی سی گھاٹی آگئی۔ اورنگ زیب گھاٹی میں اتر گیا۔ اس گھاٹی میں بڑے بڑے پتھر پڑے تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے بے ہوش لڑکی کو ایک بڑے پتھر پر لٹا دیا۔ اندھیرے میں اس کی شکل کے نقش دھندلے نظر آرہے تھے۔ وہ بے ہوش تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب کا سانس پھول رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”ہم اوپر والے ٹیلے سے ہو کر دوسری طرف جائیں گے۔ ابھی ہمارا مشن مکمل نہیں ہوا۔ چلو“

میں نے آہستہ سے کہا۔

”لڑکی کو میں اٹھاؤں گا“

اور میں نے اسی طرح لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اس کے بازو کو اپنی گردن میں ڈالا اور پھر کاندھے پر ڈال کر چلنے لگا۔ سامنے والی پہاڑی زیادہ دور نہیں تھی۔ ایک پتھریلی پگ ڈنڈی پہاڑی کے پہلو سے ہو کر دوسری طرف جا رہی تھی۔ ہم اس پر چلتے گئے۔ لڑکی کا وزن زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ پہاڑی علاقے میں کہیں چڑھائی آجاتی ہے اور کہیں اترائی آجاتی ہے۔ آدمی نے وزن اٹھایا ہوا ہو تو پہاڑوں کی اترائی پر بھی وزن زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ ہم چلتے گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب مجھ سے تین قدم آگے چل رہا تھا۔ پہاڑی کی دوسری طرف آکر اس نے دو قدم دائیں جانب ہٹ کر نیچے دیکھا۔ بولا۔

”درختوں کے نیچے مجھے ویگن کی چھت نظر آرہی ہے۔ کمانڈو رحیم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ڈگی کے موڑ پر موجود ہے۔ آجاؤ۔“

ہم نیچے اترنے لگے۔ میں نے اپنا پہلو بدلنے کی خاطر بے ہوش لڑکی کو دوسرے

مقابلے میں سب سے آخری والے کھلاڑی نے رے کو اپنے جسم کے گرد لپیٹا ہوتا ہے۔ دوسری طرف سے رسی کا تناؤ کافی ہو گیا۔ کمانڈو اورنگ زیب بے ہوش لڑکی کو کاندھے پر ڈالے رسی کی گانٹھوں کو پکڑ کر دیوار کے ساتھ پاؤں ٹکا کا آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس کا اندازہ میں نے رسی کے تناؤ سے لگایا تھا۔

یاد رکھیں۔ تربیت اور ٹریننگ بڑی چیز ہوتی ہے۔ اور خاص طور پر ایک پروفیشنل کمانڈو کو جو ٹریننگ اور تربیت دی جاتی ہے وہ اسے عام زندگی میں بھی ہر کام کو پورے سلیقے اور ڈھب سے کرنے کا انداز سکھا دیتی ہے اپنے کمانڈو آپریشن میں تو وہ اس ٹریننگ کی وجہ سے انتہائی مہارت سے کام لیتا ہے۔ عام آدمی جس کام میں اناڑی کی طرح ہاتھ ڈالتا ہے ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی نگاہ میں اس کام کا اہم ترین اور مرکزی نقطہ ہوتا ہے۔ اور اس کا پہلا ہاتھ اسی اہم ترین مرکز پر پڑتا ہے۔ ایک عام سی مثال ہے۔ ہم دو آدمی مل کر بھی کسی بے ہوش یا زخمی آدمی کو صحیح طریقے سے اٹھا کر سڑک سے گاڑی میں یا گاڑی سے نکال کر ہسپتال کے سٹریچر پر نہیں ڈال سکتے۔ ہم کبھی اسے گردن سے پکڑیں گے۔ کبھی بازوؤں سے پکڑیں گے اور کبھی ٹانگوں سے پکڑیں گے۔ لیکن ایک کمانڈو کسی ایک ایسے آدمی کا سب سے پہلے بازو پکڑے گا اور پھر ایک ہی معمولی سی حرکت کے ساتھ اسے اپنے کاندھے پر ڈال لے گا۔ میری طرح کمانڈو اورنگ زیب بھی ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ چنانچہ جب وہ بے ہوش لڑکی ارٹا کو لے کر دیوار کے اوپر آیا تو سب سے پہلے ارٹا کے دونوں بازو اور سر دیوار کے اوپر نمودار ہوا۔ اس کے بعد وہ خود دیوار پر چڑھا اور اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے رسی چھوڑ دی اور دیوار کے ساتھ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ میری پشت دیوار کے ساتھ لگی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اوپر سے بے ہوش لڑکی کو نیچے لٹکایا۔ لڑکی بالکل اسی طرح اوپر سے میرے سامنے آگئی جیسے ہوا میں معلق ہو۔ میں نے اسے کمر سے پکڑا اور زمین پر لٹا دیا۔ میں دوبارہ دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اب میرا منہ دیوار کی طرف تھا۔ کمانڈو اورنگ زیب میرے کاندھوں پر پاؤں رکھ کر نیچے کود گیا۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ یہ سارا کام بمشکل پندرہ سیکنڈ میں ہو گیا تھا۔ اورنگ

اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ صرف میں نے کمائڈو رحیم اور کمائڈو اورنگ زیب نے اپنے اپنے سیاہ نقاب اٹھا رکھے تھے۔ باقی دونوں کمائڈو نے اپنے چہرے نقاب میں چھپائے ہوئے تھے۔ یہ راز داری تھی جس سے کام لینا ضروری تھا۔ ہمیں ان کے چہرے دیکھنے کی حاجت بھی نہیں تھی۔ کمائڈو رحیم اس دوران دوڑ کر ایک چٹان کی طرف گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو خنجر تھے۔

اورنگ زیب نے لڑکی کو ایک خنجر کے اوپر ڈالا اور خود بھی اس خنجر پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا میں دوسرے خنجر پر بیٹھ گیا۔ کمائڈو رحیم بولا۔

”سرا آپ ہائیڈ آؤٹ پر جائیں ہم گاڑی چھوڑ کر آتے ہیں۔“

ہم خنچروں کو لے کر آگے چل پڑے۔ اب ہم کچے راستے سے ہٹ کر جا رہے تھے۔ میرا خنجر کمائڈو اورنگ زیب کے خنجر کے پیچھے تھا۔ پہاڑی راستہ اونچا نیچا غیر ہموار تھا۔ یہاں کوئی پگ ڈنڈی وغیرہ بھی نہیں تھی۔ ہم درختوں جھاڑیوں میں خود ہی راستہ بناتے چلے جا رہے تھے۔ کمائڈو اورنگ زیب کو معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ اس وقت آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں تھوڑی سی بجلی چمک رہی تھی۔ دور سے آتی بادلوں کی ہلکی ہلکی گرج سنائی دی اور پھر میرا خنجر جن درختوں کے نیچے چل رہا تھا ان درختوں کی شاخوں اور پتوں پر مجھے بارش کی بوندیں گرنے کی آواز سنائی دی۔ بوند باندی شروع ہو گئی تھی۔ خنجر پر بیٹھنے سے پہلے اورنگ زیب نے بے ہوش لڑکی کی کلائیوں کو پھر سے ریشمی رومال سے باندھ دیا تھا۔ یہ رومال اس نے لڑکی کے بیڈ روم سے نکلے ہوئے اس کی کلائیوں پر باندھا تھا۔ صرف دیوار سے اسے نیچے لاتے وقت اس نے رومال کھول دیا تھا اور جب ہم اسے دیوار سے اتار چکے تھے تو لڑکی کی کلائیاں اسی رومال سے دوبارہ باندھ دی گئی تھیں۔ صرف اس خیال کے پیش نظر کہ اگر لڑکی کو راستے میں ہوش آگیا تو وہ ہاتھ پاؤں چلائے گی اور ہمیں اسے سنبھالنے میں مزید وقت لگ جائے گا اور وقت کا ایک سیکنڈ بھی ہم ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کمائڈو اورنگ زیب کن کن پہاڑی راستوں پر سے ہوتا ہوا

کندھے پر ڈال لیا تھا۔ نیچے اندھیرے میں ایک تھوڑا چوڑا راستہ تھا جس کے سائے والے کنارے پر درختوں کے نیچے ایک ویگن کھڑی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی تین آدمی ویگن کے قریب سے تیزی سے نکل کر ہماری طرف آئے۔ صرف کمائڈو رحیم نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹایا ہوا تھا۔ باقی دونوں کمائڈوز کے چہرے نقاب میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں اپنے چہرے نہیں دکھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے فوراً بے ہوش لڑکی کو مجھ سے لے لیا اور کمائڈو اورنگ زیب سے دھیمی آواز میں کہا۔

”ویگن میں آ جاؤ سرا“

تینوں کمائڈو بے ہوش لڑکی کو لے کر ویگن کے عقبی حصے سے اندر چلے گئے۔ اورنگ نے مجھ سے کہا۔

”کمائڈو رحیم خود گاڑی ڈرائیو کرے گا تم اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھو گے میں لڑکی کے پاس ویگن کے اندر رہوں گا۔ گو“

میں تیزی سے ویگن کی طرف گیا اور اس کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا اور کھڑکی بند کر لی۔ دوسرے لمحے کمائڈو رحیم دوڑ کر آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے ہی اور نے سیلف لگا کر انجن شارٹ کیا اور دوسرے لمحے گاڑی پہاڑی کچے راستے پر تیزی سے نیچے کی طرف جا رہی تھی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ کمائڈو رحیم چونکہ اس علاقے سے واقف تھا اس لئے وہ بے خونی سے گاڑی بھگائے لئے جا رہا تھا۔ گاڑی کے راستے کے سنگریزوں کو گولیوں کی طرح ادھر ادھر اڑا رہی تھی۔ ہماری ایک جانب ٹیلے کا جھاڑیاں رات کے اندھیرے میں اوپر تک چلی گئی تھیں اور دوسری جانب نشیب میں کوڑا گھاٹی تھی۔ گاڑی دو تین ٹیلوں کا چکر کاٹنے کے بعد ایک کھلی جگہ پر آ کر رک گئی۔ کمائڈو رحیم نے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔

”سرا یہاں اتریں گے“

میں بھی اس کے ساتھ ہی نیچے اتر آیا۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھل گیا۔ کمائڈو اورنگ زیب نے ایک اور نقاب پوش کمائڈو سے مل کر لڑکی کو باہر نکالا۔ اورنگ زیب نے لڑکی

مٹی اور پتھروں کے ٹبے کے اندر ایک کوٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ کمانڈو رحیم نے جلدی سے کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اندر ایک لیمپ جل رہا تھا۔ ایک پرانی چارپائی پر بستر بچھا تھا۔ ایک پرانا لحاف بھی تھا۔ اورنگ زیب نے لڑکی کو چارپائی پر لٹا کر لحاف اوپر ڈال دیا۔ ہم نے جھک کر لڑکی کو دیکھا۔ اس کا سانس چل رہا تھا مگر وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اس نے لڑکی کے ہونٹوں پر چمکی ہوئی شپ کھینچ کر اتار دی۔ لڑکی کے ہونٹ لیمپ کی روشنی میں سفید سفید سے نظر آئے۔ اورنگ زیب نے کمانڈو رحیم سے پوچھا۔

”تمہ خانے میں کوئی اچھا سا بستر بچھانا تھا اور وہاں لحاف کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“

رحیم بولا۔

”میں نے نیا بستر لگایا ہے اور دو کمبل رکھ دیئے ہیں۔ اسے نیچے لے آئیں“

کوٹھڑی کی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جس کے آگے چارپائی کھڑی کر کے رکھی ہوئی تھی۔ رحیم نے دروازہ کھول دیا۔ وہاں سے ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ رحیم پہلے نیچے اتر گیا۔ میں اور کمانڈو اورنگ زیب اوپر کھڑے اندھیرے میں زینے کو دیکھ رہے تھے۔ زینے میں ہلکی سی روشنی ہوئی۔ رحیم نے تمہ خانے میں دیا جلا دیا تھا۔ اس نے نیچے سے آواز دی۔

”سرا اسے لے آئیں۔“

میں نے آگے بڑھ کر بے ہوش لڑکی کو کندھے پر اٹھالیا۔ اور کمانڈو اورنگ زیب کے پیچھے پیچھے زینہ اتر کر نیچے آیا تو دیکھا کہ نیچے جو تمہ خانہ تھا وہ اوپر والی کوٹھڑی سے

آخر ایک کھلی جگہ پر آگیا۔ مجھے اندھیرے میں ایک اونچا سا گرجے کی طرز کا دروازہ دکھائی دیا۔ کمانڈو اورنگ زیب دروازے کے اندر جانے کی بجائے اس کی دیوار کے ساتھ ہر گیا۔ میں خچر ذرا تیز چلا کر اس کے پہلو میں آگیا۔ اس وقت بوند باندی برابر جاری تھی لڑکی کمانڈو اورنگ زیب کے آگے اس طرح اوندمی پڑی تھی کہ اس کے بازو اور سر خچر کی ایک جانب اور دونوں ٹانگیں دوسری جانب لٹک رہی تھیں۔ اورنگ زیب کہنے لگا۔

”کلو رو فارم کی دوز شاید زیادہ دے دی گئی ہے۔ ابھی تک یہ ہوش میں نہیں آئی۔“

میں نے پوچھا۔

”یہ دروازہ کس جگہ کا تھا؟“

اورنگ زیب نے کہا۔

”یہ گوروں کا پرانا قبرستان ہے۔ ہم قبرستان کی دیوار کے ساتھ چل رہے ہیں۔“

قبرستان کے پیچھے آکر ہم دیوار سے ہٹ کر سامنے کی جانب آگئے جہاں اندھیرے میں بڑے بڑے پتھر نظر آئے۔ ان پتھروں کے درمیان سے گزرنے کے بعد اورنگ زیب کا خچر ایک طرف کو مڑ گیا۔ سامنے ایک بڑا سا بنا ہوا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ مٹی اور پتھروں کا ایک بہت بڑا ڈھیر لگ رہا تھا۔ ہم خچروں سے اتر رہے تھے کہ ٹبے کے پیچھے سے کمانڈو رحیم نکل کر ہماری طرف آیا اور بولا۔

”سر آجائیں“

عورت بڑی ہوشیار اور سمجھدار ہے۔ وہ لڑکی کے پاس تہہ خانے میں رہے گی۔ میں اوپر پہرہ دوں گا۔ ویسے بھی آپ کو معلوم ہے کہ یہ دیران جگہ ہے۔ ادھر کوئی نہیں آتا۔ کوئی آیا بھی تو شک پڑنے پر یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکے گا۔ یہاں قبرستان میں بہت سی پرانی قبروں کے گڑھے ہیں ہم اسے وہاں دبا کر اوپر قبر بنادیں گے۔

کمانڈو رحیم ہنسنے لگا۔ اورنگ زیب بڑے سنجیدہ چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ کمانڈو رحیم کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ہم نے اپنی شین گنیں ایک طرف رکھ دیں۔ ہسپتال اپنی اپنی بیلٹوں کے ساتھ لگے رہنے دیئے۔ چاروں ہینڈ گرنیڈ نکال کر کمانڈو رحیم کو دیئے۔ کلو رو فام کی شیشی بھی اورنگ زیب نے ناکون کی رسی کے ساتھ اس کے حوالے کر دی۔ ہم نے اپنی جیکٹوں کے زپ آگے سے کھول دیئے تھے۔ اور نقاب والی ٹوپیاں سر سے نیچے کر رکھی تھیں۔ میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

”ابھی رات کا ایک بھی نہیں بجا۔“

کمانڈو اورنگ زیب ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ہمارا یہ کمانڈو آپریشن اپنے مقررہ وقت کے اندر ختم ہوا ہے۔“

بے ہوش لڑکی کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی۔ ہم جلدی سے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اسے ابھی پوری طرح ہوش نہیں آیا تھا۔ اس پر کلو رو فام کے بعد کی نقاہت طاری تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہم لڑکی کو تہہ خانے میں چھوڑ کر اوپر والی کوٹھڑی میں آگئے۔ کمانڈو رحیم کہنے لگا۔

”سر! آپ آرام کریں میں باہر پہرہ دوں گا۔ وہ کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ شین گن اس کے پاس ہی تھی۔ میں اور کمانڈو اورنگ زیب چارپائی پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے پوچھا۔“

”کل کا کیا پروگرام ہوگا؟“

وہ بولا۔

”ہمیں کچھ دیر کے لئے اسی جگہ روپوش ہو کر رہنا ہوگا۔ یہ محفوظ جگہ ہے۔ لیکن

دو گنا بڑا اور کشادہ تھا۔ اس کی چھت بھی اونچی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ اصل مقصد اس تہہ خانے کی تعمیر تھی۔ اوپر والی کوٹھڑی محض دکھاوے کے لئے بنائی گئی ہے۔ تہہ خانے میں ایک جانب دیوار کے ساتھ لگی ہوئی کچھ رانٹلیں نظر آئیں۔ ایک بڑا سا پلنگ تھا جس پر صاف بستر بچھا تھا اور دو کمبل پڑے تھے۔ میں نے لڑکی کو پلنگ پر لٹا دیا۔ کمانڈو رحیم نے جلدی سے دونوں کمبل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے اور لڑکی کے اوپر ڈال دیئے۔

میں نے کمانڈو رحیم سے کہا۔

”کلو رو فام کچھ زیادہ ہی سنبھلا دیا گیا ہے۔“

وہ بولا۔

”کچھ لڑکی کا جسم بھی کمزور ہے۔ کوئی بات نہیں ابھی ہوش آجائے گا۔“

وہاں دو تین مونڈھے پڑے تھے۔ ہم مونڈھے کھینچ کر بیٹھ گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”خدا کا شکر ہے ہمارا مشن کامیابی سے مکمل ہو گیا۔“

میں نے کہا۔

”مجھے نہیں امید کہ ابھی تک وہاں کسی کو لڑکی کی گمشدگی کا علم ہوا ہو۔“

”علم ہو بھی گیا ہو گا تو اب ہمیں ان کی فکر نہیں۔ ہم ان کی پہنچ سے نکل آ۔“

ہیں۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے رحیم سے پوچھا۔

”تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟ یہاں ہمارے جانے کے بعد کیا تم اکیلے پہرہ

گئے؟“

کمانڈو رحیم نے کہا۔

”ان دونوں کی اتنی ہی ڈیوٹی تھی سر۔ وہ چلے گئے ہیں۔ ان کی جگہ یہاں صبح ۱۱

ایک بوڑھا ساتھی اپنی بیوی کے ساتھ آئے گا۔ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر چلا جائے گا

”تم اس کے ناشتے وغیرہ کا بندوبست کرو۔ ہم نیچے جا کر اسے دیکھتے ہیں۔“
میں اور کمانڈو اورنگ زیب تمہ خانے میں آگئے۔ تمہ خانے میں دیا روشن تھا۔ ارملہ ہوش میں آچکی تھی اور پانگ پر بیٹھی پھٹی پھٹی نظروں سے فضا میں تک رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی اور بولی۔

”تم لوگ مجھے کہاں لائے ہو۔ تم ضرور کشمیری اگر وادی ہو۔ بھگوان کے لئے مجھے قتل نہ کرنا۔“

وہ روئے جا رہی تھی۔ ہم مونڈھے کھینچ کر اس کے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”مس ارملہ! ہم کشمیری دہشت گرد نہیں ہیں ہم کشمیری مجاہد ہیں۔ تمہیں ہم تمہارے بیڈ روم سے اس لئے اغوا کر کے لے آئے ہیں کہ تمہارے پتاجی نے ہمارے ایک شریف آدمی کی بیٹی کو اغوا کیا ہوا ہے۔ ہم تمہارے فادر کو فون کرنے والے ہیں۔ ہم تمہارے بدلے اپنے بزرگ مجاہد کی معصوم بیٹی پروین کو واپس لینا چاہتے ہیں۔“
ارملہ کا اردو بولنے کا لہجہ بنگالی تھا۔ وہ بولی۔

”اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے میرے گھر پہنچا دو پلیز۔ میرے پرسوں امتحان شروع ہونے والے ہیں پلیز!“

وہ روئے جا رہی تھی۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

”تمہارے رونے کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ جس طرح تم کسی باپ کی بیٹی ہو اسی طرح پروین بھی کسی باپ کی بیٹی ہے۔ تمہارے پتاجی نے پروین کو اپنے فوجیوں کی مدد سے اغوا کر کے فوجی چھاؤنی میں قید کر رکھا ہے۔ وہ کالج میں پروفیسر ہے۔ کیا پروین کے باپ کو بیٹی کے اغوا کا دکھ نہیں ہوگا؟“

ارملہ نے ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے چھوڑ دو۔ میں پتاجی سے کہہ کر پروین کو رہا کرادوں گی۔ میں تم سے پر اس کرتی ہوں۔ پتاجی میری بات ضرور مان جائیں گے“

کل کسی وقت میں بریگیڈیئر کو گھر پر فون کرنے کے لئے یہاں سے نکلوں گا۔ ہمیں فون پر اس کو بتانا ہوگا کہ اس کی بیٹی ارملہ ہمارے پاس ہے اور اس کی عزت و ناموس کے ہم ذمہ دار ہیں۔ پھر اس سے ارملہ کے بدلے حاجی صاحب کی بیٹی پروین کی رہائی کے بارے میں سودا کرنا ہوگا۔“

”میرا خیال ہے وہ ضرور مان جائے گا۔“

”اسے ماننا ہی پڑے گا۔ بات ہی ایسی ہے“

”کیا پروین کو ہم یہاں وصول کر کے خود سری نگر لے جائیں گے؟“

میرے پوچھنے پر اورنگ زیب نے کہا۔

”ہم یہ غلطی کبھی نہیں کریں گے۔ پروین کو بریگیڈیئر مکرچی خود اپنی حفاظت میں سری نگر پہنچائے گا۔ جب ہمیں اطلاع مل جائے گی کہ پروین اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ گئی ہے تب ہم بریگیڈیئر مکرچی کی بیٹی کو اس کے حوالے کریں گے۔ ہم اس تپ کے پتے کو یونہی ضائع نہیں کر سکتے۔“

اس موضوع پر کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد ہم وہیں ادھر ادھر پڑ کر سو گئے۔ اس وقت باہر دن نکل آیا تھا جب کمانڈو رحیم نے ہمیں آکر جگایا اور کہا۔

”سرا! ہمارا بوڑھا کشمیری ساتھی اپنی بیوی کو لے کر آگیا ہے۔“

وہ دونوں کو ٹھڑی میں ایک طرف بیٹھے تھے۔ دونوں کی عمریں بڑھاپے کی سرحد کو چھو رہی تھیں۔ عورت بھاری بدن کی صحت مند کشمیرن تھی۔ اس نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ اس کا نام صفراں تھا۔ ہم نے صفراں کے خاوند کو وہیں سے واپس بھیج دیا۔ صفراں مونڈھے پر چادر اوڑھے بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔ میں نے رحیم سے پوچھا۔

”نیچے ارملہ کو ہوش آگیا ہے کیا؟“

وہ بولا۔

”سرا! دو گھنٹے پہلے میں نیچے جا کر دیکھ آیا تھا۔ وہ سو رہی تھی۔“

اورنگ زیب بولا۔

میں نے کہا۔

”لڑکی بنگال ہے اور کمزور جسم کی بزدل ہے۔ وہ ایسی کوشش نہیں کرے گی۔ بہر حال تمہیں ہر طرح سے چوکس رہنا ہوگا۔ تمہ خانے کا دروازہ ہر وقت بند رکھنا ہوگا۔ وہ کہے بھی تو اسے اوپر ہرگز نہیں آنے دیتا۔ رحیم اور ہمارے ساتھی اوپر پہرے پر موجود رہیں گے۔“

صغراں نیچے تمہ خانے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد رحیم ناشتہ لے آیا۔ چائے تھی۔ ساتھ بند تھے۔ ہم نے نیچے ارملہ کے لئے بھی ناشتہ بھجوا دیا۔ اور خود بھی کوٹھڑی میں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ چائے کی ایک ایک پیالی پینے کے بعد ہم کوٹھڑی سے باہر کھلی فضا میں آگئے۔ رات کو بارش ہوئی تھی۔ زمین اور بڑے بڑے پتھر گیلے تھے۔ آسمان اسی طرح ابر آلود تھا۔ معمولی سی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہم بٹے کی ایک طرف ہو کر درخت کے نیچے بیٹھ کر سگریٹ پینے اور باتیں کرنے لگے۔ ہمارا اگلا آپریشن نہایت اہم تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اب تک بریگیڈیئر کو اپنی بیٹی کے اغوا کا پتہ چل چکا ہوگا اور شیلے کی فوجی چھاونی اور گیرزن میں فوج الرٹ ہو گئی ہوگی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے بریگیڈیئر نے اپنی بیٹی کے اغوا کی رپورٹ ملٹری پولیس کو دے دی ہوگی؟“

اورنگ زیب نے کہا۔

”معاملہ بہت سنگین ہے۔ اس نے شیلے میں تعینات پوری فوج کو الرٹ کر دیا ہوگا۔ ملٹری پولیس نے جہاں تک میرا خیال ہے شیلے کی پوری ناکہ بندی کر لی ہوگی۔“

ہمیں دور گوروں کے قبرستان کی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک آدمی اپنی طرف آتا نظر آیا۔ اس نے چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ ہم جلدی سے کوٹھڑی میں چلے آئے۔ کمائدو رحیم کوٹھڑی کے دروازے کی اندر کی جانب موجود تھا۔ اس نے ہمیں آتا دیکھ لیا تھا۔

کمائدو اورنگ زیب نے اسے کہا۔

”ایک آدمی ادھر آ رہا ہے۔ معلوم کرو۔“

کمائدو اورنگ زیب نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”مائی ڈیئر لیڈی ایک بات کو یاد رکھو جب تک ہمارے مجاہد کی بیٹی پروین ہمیں واپس نہیں ملے گی ہم تمہیں تمہارے باپ کے حوالے نہیں کریں گے۔“

ارملہ پڑھی لکھی سمجھدار بنگالی لڑکی تھی۔ اس نے پوچھا۔

”اور اگر پتا ہی نہ مانے تو پھر تم کیا کرو گے؟“

کمائدو اورنگ زیب نے کہا۔

”یہ ہم اس وقت سوچیں گے۔ ابھی تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ یہ سامنے غسل خانہ ہے تمہاری مدد کے لئے ایک عورت تمہارے پاس آرہی ہے۔ وہ تمہارا خیال رکھے گی۔ تمہیں دوسرے کپڑے بھی مل جائیں گے۔ اس بات کا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہاں تمہاری عزت آبرو اسی طرح محفوظ رہے گی جس طرح تمہارے اپنے گھر میں محفوظ تھی۔ ہم مسلمان کشمیری مجاہد ہیں۔ اسلام ہمیں عورتوں سے چاہے وہ کافر عورتیں ہوں عزت و احترام کے ساتھ پیش آنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ یہاں سے کبھی فرار ہونے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ یہ ایسی جگہ ہے کہ تم قیامت تک باہر نہیں نکل سکو گی۔ ہمارے کمائدو چاروں طرف پہرہ دے رہے ہیں۔“ ہم اٹھ کر اوپر آگئے۔ اورنگ زیب نے صغراں سے کہا۔

”بی بی! کمائدو رحیم نے اس لڑکی کے بارے میں تمہیں ساری بات سمجھا دی ہوگی۔“

صغراں بولی۔

”ہاں بیٹا۔ مجھے سب معلوم ہو گیا ہے تم فکر نہ کرو۔ میں لڑکی کی پوری حفاظت کروں گی۔ یہ دیکھو۔“

اس نے اپنے لمبے فرن کی جیب میں سے ایک چھوٹا پستول نکال کر دکھایا۔

”یہ بھرا ہوا پستول میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ اس پستول کے ہوتے ہوئے لڑکی فرار ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

سے فون پر رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک تو ہمیں بریگیڈیئر کے گھر کا فون نمبر لادے۔ دوسرے ہمیں یہ بتائے کہ کس جگہ سے اسے فون کرنا مناسب رہے گا۔ جاؤ۔“

کمانڈو رحیم نے شین گمن اتار کر دیوار سے لٹکائی۔ کبل کی بکلی مار لی اور کوٹھڑی سے نکل گیا۔ میں نے اورنگ زیب سے اس خدشے کا اظہار کیا کہ بریگیڈیئر اگر گھر پر نہ مل سکا اور ہم نے گھر والوں سے کہا کہ بریگیڈیئر سے کہو کہ فوراً گھر پہنچے ہم اس کی بیٹی کے بارے میں اس سے بات کرنا چاہتے ہیں تو اسی دوران ملٹری انٹیلی جنس ایسا انتظام ضرور کر لے گی کہ بریگیڈیئر سے فون پر بات کرنے کے دوران وہ معلوم کر لیں گے کہ یہ فون کہاں سے کیا جا رہا ہے۔ بریگیڈیئر جان بوجھ کر فون پر گفتگو کو طول دے گا تاکہ ملٹری انٹیلی جنس کے آدمی جہاں سے ہم فون کر رہے ہیں وہاں پہنچ کر ہمیں پکڑ لے تو کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”یہ بات میرے ذہن میں ہے۔ لیکن ہمارے سامنے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔ ہم وائلیس پر اس سے بات نہیں کر سکتے۔ مجبوراً ہمیں ٹیلی فون کا ہی سہارا لینا ہوگا۔ یہ خطرہ مول لیتا ہی پڑے گا۔ مگر ہم مختصر بات کریں گے اور ہر بار کسی نئی جگہ سے ٹیلی فون کریں گے۔ شملہ ایک بڑا شہر ہے۔ یہاں اتنی جلدی ٹیلی فون سپاٹ چیک نہیں کیا جاسکے گا۔“

اتنے میں صفراں تہہ خانے سے اوپر آئی اور کہنے لگی۔

”میں نے لڑکی کو کھلا پلا دیا ہے۔ وہ بے چاری تو بے حد ڈری ہوئی ہے۔ بس روئے جاتی ہے۔“

میں نے کہا۔

”اس کے رونے پر ترس مت کھانا۔ بس جس طرح بھی ہو سکے دو تین دن تک تہہ خانے میں ہی رکھنا اور زندہ رکھنا۔“

صفراں چارپائی پر سے ایک چادر اٹھا کر زینے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

”میرے ہوتے ہوئے وہ نہ یہاں سے باہر قدم نکال سکتی ہے نہ مر سکتی ہے۔“

کمانڈو رحیم جلدی سے شین گمن لے کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اسی آدمی کے ساتھ لے کر اندر آگیا۔ کہنے لگا۔

”سرا یہ اپنا آدمی ہے۔ شہر کی خبر لایا ہے۔“

اس آدمی نے بتایا کہ شہر میں سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ کشمیری مجاہدوں نے بریگیڈیئر کمرچی کی بیٹی کو اغوا کر لیا ہے اور وہ اس کے بدلے اپنے مجاہد کی بیٹی کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ شملے کے مسلمان بڑے خوش ہیں۔ ملٹری انٹیلی جنس کے آدمی سفید کپڑوں میں سارے شہر اور ارد گرد کے دیہات میں پھیل گئے ہیں۔ پولیس اور فوج نے شملے کے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر لی ہے۔ سولن سے ایک ہٹالین فوج بھی شٹل میں آگئی ہے۔

”لوگ کہتے ہیں کہ انبالے سے انڈین کمانڈو فورس بھی شملے کے لئے چل پڑا ہے۔“

ہم اس صورت حال کے لئے بالکل تیار تھے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اس آدمی سے پوچھا۔

”اس علاقے کی طرف تم نے کسی مشکوک آدمی کو تو چلتے پھرتے نہیں دیکھا؟“

وہ بولا۔

”سرا ہمارے آدمی اس علاقے میں موجود ہیں۔ اگر ایسی بات ہوئی تو ہم آپ کو فوراً خبر کر دیں گے۔“

وہ آدمی چلا گیا۔ کمانڈو رحیم کہنے لگا۔

”ہمارے دو آدمی قبرستان کے گیٹ کے پاس چھپ کر پہرے پر موجود ہیں۔ وہ کسی مشکوک آدمی کو اس طرف نہیں آنے دیں گے۔ اول تو فوج کا کوئی سپاہی اس طرف نہ آئے گا اگر کوئی ابھی گیا تو ہمارے آدمی انہیں وہیں ختم کر دیں گے۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے رحیم سے کہا۔

”تم فوراً شہر میں جا کر شمس خواجہ سے کسی طرح ملو۔ اسے کہو کہ ہم بریگیڈیئر کمرچی کے ساتھ لے کر اندر آگیا۔ کہنے لگا۔“

ہمارے لئے ایک ایک لمبے گزانا مشکل ہو رہا تھا۔ قدرتی طور پر ہم اس لئے بے چین تھے کہ ہمیں جتنی جلدی ہو سکے ار ملا کے باپ بریگیڈیئر مکرچی سے رابطہ پیدا کرنا تھا تھا تاکہ بات آگے بڑھ سکے۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد کمانڈو رجیم واپس آیا۔ وہ شملے میں اپنے ماسٹر سپائی شمس خواجہ سے مذاکرات کر کے آیا تھا۔ کہنے لگا۔

”شمس خواجہ نے مجھے بریگیڈیئر کے گھر کا ٹیلی فون نمبر دے دیا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں شملے کے بڑے پوسٹ آفس سے پہلا فون کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ضروری ہوا تو ہمیں بڑے گر جا گھر کے پاس جو پبلک ٹیلی فون بوتھ ہے وہاں سے فون کرنا ہوگا۔ اس نے تاکید کی ہے کہ ہمیں اسی طرح جگہ بدل بدل کر فون کرنا چاہئے۔ مگر اس نے ایک بات کی سختی سے ہدایت کی ہے کہ بریگیڈیئر سے کسی صورت بھی بات لمبی نہیں کرنی ہوگی اور معاملہ ایک دو ٹیلی فون کال میں طے کر لیتا ہوگا۔“

کمانڈو رجیم نے صدری کی جیب سے ایک کانڈ کا پرزہ نکال کر دیا۔ اس پر بریگیڈیئر کے گھر کا ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ اورنگ زیب نے کانڈ کو سنبھال کر رکھ لیا اور کمانڈو رجیم سے کہا۔

”ہم جنرل پوسٹ آفس بریگیڈیئر کے گھر فون کرنے جاتے ہیں۔ تم یہاں کا خیال رکھنا۔“

ہم نے کمانڈو والی جرسیاں جو صبح پہن لی تھیں اتار دیں۔ سیاہ جوگر شوز کی جگہ عام جوتے پہن لئے۔ جیکٹس بھی اتار دیں۔ ان کی جگہ ایک ایک پرانی گرم چادر کی بکلی مارلی۔ اتنا ضرور کیا تھا کہ ہم نے ایک ایک سائی لینسر والا آٹو میک پستول اپنی پتلون کی جیب میں چھپا کر ضرور رکھ لیا تھا۔ میں نے سر پر مظہر لیٹ لیا۔ کمانڈو اورنگ زیب نے اون کی بنی ہوئی ٹوپی پہن لی۔ اس طرح ہم تہہ خانے والی کوٹھڑی سے نکل کر اس کے پیچھے سے چکر کاٹ کر قبرستان کے سامنے والی سڑک پر نکل آئے۔

بوندا باندی رک گئی تھی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہم بڑے سکون کے ساتھ آہر میں شملے میں بولی جانے والی ڈوگری ہندی میں باتیں کرتے یوں چلے جا رہے تھے چپے

بارش رکنے کے بعد شہر کے بازار میں کچھ خرید و فروخت کرنے جا رہے ہوں۔ قبرستان ہے ہم ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر چھوٹی سی پختہ سڑک پر آگئے جو شملے کے چھوٹے سے ریلوے سٹیشن کے عقب سے ہوتی ہوئی مال روڈ کے چوک کی طرف نکل جاتی تھی۔ ہم دیے خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ کوئی شخص ہمارے سامنے سے آ رہا ہوتا یا پیچھے سے آگے گزر جاتا تو ہم ڈوگرہ ہندی میں باتیں کرنے لگتے۔ ہمیں دیکھ کر کسی کو خیال نہیں آسکتا تھا کہ ہم دو انتہائی خطرناک اور تربیت یافتہ کمانڈو ہیں اور بریگیڈیئر کی بیٹی کو ہم نے ہی اغوا کیا ہے۔ شملے کی مال روڈ کے چوک میں ایک طرف بڑے ڈاک خانے کی انگریزی طرز کی شاندار عمارت تھی۔ مال پر کافی لوگ آ جا رہے تھے۔ دکانیں کھلی تھیں۔ ہم ایک مندر کے قریب سے گزرے جس کی دیوار پر کتنے ہی بندر بیٹھے مزے سے کچھ کھا رہے تھے۔ شملے میں بندر بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ہندو لوگ ان بندروں کو مقدس جانور سمجھتے ہیں اور ان کو مٹھائیاں اور پھل کھلاتے ہیں۔ اس کی تاریخی وجہ یہ ہے کہ جب رام اور لکشمن سیتا کے ساتھ بن باس میں تھے تو لنگا کا راجہ راون، رام چندر راجہ کی بیوی سیتا کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ رام چندر نے اپنی بیوی کو چھڑانے کے لئے لنگا پر چڑھائی کی تو ہنومان نام کے ایک شخص نے اپنے پورے قبیلے کی فوج کے ساتھ راجہ رام چندر کی مدد کی تھی۔ کہتے ہیں ہنومان کا تعلق جس قبیلے سے تھا اس کے لوگوں کی شکلیں بندروں سے ملتی جلتی تھیں۔ اس وجہ سے ہندو لوگ بندروں کی عزت کرتے ہیں۔ اور انہیں کبھی کبھہ نہیں کہتے۔ شملے کے آس پاس کے علاقے میں بندر گھروں میں بڑی آزادی سے داخل ہوتے ہیں اور جو چیز چاہے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور کوئی انہیں کچھ نہیں کہتا۔

بہر حال ہم بڑے ڈاک خانے میں پہنچ گئے۔

ڈاک خانے کے اندر چار پانچ شیشے کے بند ٹیلی فون بوتھ بنے ہوئے تھے۔ ایک ٹیلی فون بوتھ خالی تھا۔ میں اور کمانڈو اورنگ زیب بوتھ میں داخل ہو گئے۔ ہم نے شیشے کا دروازہ بند کر دیا۔ اورنگ زیب نے جیب سے وہ کانڈ نکال کر سامنے رکھ لیا جس پر بریگیڈیئر مکرچی کے گھر کا ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے نمبر ڈائل کر دیا میں اسی کی

طرف دیکھ رہا تھا۔ اورنگ زیب نے کہا۔

”ہیلو میں بریگیڈیئر کمری سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

ایک سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد اورنگ زیب نے پوچھا۔

”اگر آپ ہی بریگیڈیئر کمری بول رہے ہیں تو میں آپ کو ایک ضروری پیغام دیتا

چاہتا ہوں۔ غور سے سنئے۔ آپ کی بیٹی ارملہ کمری ہماری تحویل میں ہے۔ اس کی عزت

آبرو محفوظ ہے۔ یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ سری نگر کے کمانڈنگ آفیسر کرنل بھگت

رام نے بزرگ کشمیری مجاہد حاجی ثناء اللہ کی بیٹی پروین کو اغوا کر کے شملے کے فوجی کیمپ

میں پہنچا دیا ہوا ہے۔ نہیں نہیں نہیں۔ خاموش رہیں۔ صرف میری بات سنیں میرے پاس

زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں آپ کو یہ پیغام دیتا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اپنی بیٹی کو زندہ حالت

میں واپس لینا چاہتے ہیں تو پروین کو ہمارے حوالے کر دیں۔ اس سلسلے میں جگہ اور وقت

کا تعین بعد میں کر لیا جائے گا۔ لیکن ایک بات کو غور سے سن لیں۔ اس معاملے میں

دونوں طرف سے انتہائی رازداری سے کام لیا جائے گا۔ اگر آپ نے ملٹری پولیس یا ملٹری

کمانڈو فورس یا شملہ پولیس کی مدد لینے کی کوشش کی تو ہمارا آدمی تو ضرور پکڑا جائے گا

لیکن پھر آپ کی بیٹی ارملہ بھی زندہ نہیں رہے گی۔ اس کا کٹنا ہوا سر آپ کے گھر بڑی

جلدی پہنچا دیا جائے گا۔ میرے دوسری فون کال کا انتظار کریں۔“

یہ کہہ کر اورنگ زیب نے فون بند کر دیا اور مجھ سے کہا۔

”یہاں سے نکل چلو“

ہم ٹیلی فون بوتھ میں سے بظاہر بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ مسکرا مسکرا کرتے باہر

کرتے باہر نکلے۔ اس طرح باتیں کرتے پوسٹ آفس کی لابی میں موجود لوگوں کے درمیان

سے گزرتے ہوئے جزل پوسٹ آفس کی عمارت سے نکل کر سیڑھیاں اترتے مال روڈ کے

چوک میں آگئے اور پھر بائیں جانب والی چھوٹی سڑک پر ہو گئے۔ چھوٹی سڑک پر آتے ہی

ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ یہاں سے ایک پگ ڈنڈی نیچے پھاڑنی ڈھلان پر اترتی تھی۔

ہم اس پگ ڈنڈی پر اتر گئے۔

واپس اپنی قبرستان کے پچھواڑے والی کوٹھڑی میں آکر اورنگ زیب نے کمانڈو رحیم

کو ٹیلی فون پر بریگیڈیئر کمری سے کی گئی گفتگو کے بارے میں بتایا اور کہا۔

”بریگیڈیئر کے گھر میں ہماری رازدار نوکرانی کو فوری طور پر پیغام پہنچا دو کہ وہ گھر

میں آنے جانے والے لوگوں اور فوجی افسروں سے ٹیلی فون پر کی جانے والی بات چیت غور

سے سنی رہے۔ ہمیں ہر رات کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ بریگیڈیئر کمری اپنی بیٹی کو واپس

لانے کے سلسلے میں کیا حکمت عملی اختیار کر رہا ہے۔“

کمانڈو رحیم نے کہا۔

”یہ کام ہو جائے گا۔“

ہم نے سارا دن ٹبے والی کوٹھڑی میں گزار دیا۔ اس دوران ارملہ کو جا کر بتا دیا کہ

اس کے پتلی سے بات ہو گئی ہے۔ جس وقت پروین سری نگر پہنچا دی جائے گی اسے اس

کے باپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

جب رات کا پہلا پہر شروع ہوا تو میں اور کمانڈو اورنگ زیب بریگیڈیئر کمری کو

دوبارہ فون کرنے قبرستان کے ویران علاقے سے نکل کر شملے کے بڑے گرجا کے عقب

میں جو پبلک ٹیلی فون بوتھ بنا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ گئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کمری کو فون

کیا تو وہ گھر پر ہی تھا۔ ان دونوں کے درمیان گفتگو شروع ہو گئی۔ کوئی ایک منٹ تک

بات ہوتی رہی بات ہو رہی تھی کہ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”مسٹر کمری! میں آپ کو کل شام تک کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر کل شام تک آپ

نے حاجی ثناء اللہ صاحب کی بیٹی پروین کو اپنے خاص حفاظتی سکوڈ کے ساتھ سری نگر

روانہ نہ کیا تو اس کا جو افسوسناک نتیجہ نکلے گا وہ شاید آپ سے برداشت نہ ہو۔“

یہ کہہ کر اورنگ زیب نے فون بند کر دیا۔ کہنے لگا۔

”بریگیڈیئر اپنی مجبوریاں بیان کر رہا تھا کہ پروین اس کی کسٹڈی میں نہیں ہے اسے

نکالنا اس کے اختیار میں نہیں ہے راستے میں کئی مشکلات حائل ہیں۔ آپ میری بیٹی کو

بھونڈ دیں۔ آپ جتنی رقم کہتے ہیں میں آپ کو دے دوں گا۔ اور کسی سے ذکر بھی نہیں

اب ہمیں کل کا دن یعنی دوسرا دن تیسرا دن تجتس اور تذبذب کی حالت میں گزارنا تھا۔ ہم نے ار ملا مکرمی کو کچھ نہ بتایا۔ دوسرا دن گزر گیا۔ دوسری رات بھی گزر گئی۔ تیسرے دن صبح کے وقت ہم نے کمانڈو شیروان سے اپنے خفیہ ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ پیدا کیا تو اس نے انتہائی مسرت کے ساتھ ہمیں یہ خوش خبری سنائی کہ حاجی ثناء اللہ زار کی بیٹی پروین آج صبح ٹھیک چھ بج کر دس منٹ پر اپنے گھر خیریت سے پہنچ گئی ہے۔ کمانڈو شیروان نے مزید بتایا کہ اسے دو عورتیں ٹیکسی میں گھر چھوڑ گئی تھیں۔ کمانڈو اورنگ زیب ٹرانسمیٹر پر شیروان سے بات کر رہا تھا۔ اس سے میں نے بھی بات کی۔ اس نے مجھے بھی مشن کی کامیابی پر مبارک باد دی اور کہا۔

”بریگیڈیئر کی بیٹی کو انتہائی ہوشیاری کے ساتھ اس کے گھر کے قریب چھوڑ دینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ملٹری انٹیلی جنس نے تم لوگوں کی گرفتاری کے لئے جال بچھا رکھا ہو۔“

میں نے کہا۔ ”ہم محتاط رہیں گے۔“

”اور تم واپس میرے پاس آجانا۔ ایک اور مشن کے سلسلے میں تم سے گفتگو کرنی ہے۔“

میں نے کہا۔

”میں پہنچ جاؤں گا سہرا“

ریڈیو ٹرانسمیٹر کے سنگل بند ہو گئے۔ میں نے کمانڈو شیروان کی ہدایت کمانڈو اورنگ زیب کو بھی بتادی وہ کہنے لگا۔

”ہم ار ملا کو اپنی خفیہ کمیں گاہ کے آس پاس نہیں چھوڑ سکتے۔ اس سے ہماری کمیں گاہ کا سراغ لگ سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔

”پھر تمہارا کیا خیال ہے؟“

اورنگ زیب بولا۔

کروں گا۔“

میں نے کہا۔

”یہ بات میرے ذہن میں بھی واضح نہیں ہے کہ ایک ذمہ دار بریگیڈیئر رینک کا افسر دوسری رجمنٹ کے ہاؤس ارسٹ میں رکھی گئی لڑکی کو کیسے نکال کر سری نگر پہنچائے گا۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے سخت لہجے میں کہا۔

”یہ سوچنا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ ہماری درد سر نہیں ہے۔ یہ اس کی درد سر ہے۔“

ایک غیر شادی شدہ نوجوان بیٹی کا باپ ہے جو اغوا کی جا چکی ہے۔ اس کی زندگی اور عزت آتش فشاں پہاڑ کے دہانے کے اوپر لٹک رہی ہے۔ میں نے اسے کل شام تک کالٹی میڈ دے دیا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ آؤٹ آف دی وے جا کر بھی اپنی بیٹی کی زندگی اور آہر بچائے گا۔“

ہم جلدی جلدی ایک ٹیلے کی اترائی اتر رہے تھے۔ رات گزر گئی۔ دوسرا دن بھر ذہنی کش مکش کی حالت میں گزر گیا۔ ہم قبرستان والی کوٹھڑی میں ہی چھپے بیٹھے رہے۔ جب سورج غروب ہو گیا اور شام کے سائے پھیلنے لگے تو میں اور کمانڈو اورنگ زیب ایک بار پھر بریگیڈیئر کو فون کرنے کے لئے کوٹھڑی سے نکل پڑے۔

اس دفعہ ہم نے شملے کے ایک دوسرے علاقے میں جا کر پبلک ٹیلی فون بوتھ سے فون کیا۔ بریگیڈیئر گھر پر موجود تھا۔ میں بوتھ کے باہر کھڑا ہو گیا۔ اورنگ زیب بوتھ میں جا کر فون کرنے لگا۔ وہ ایک منٹ سے زیادہ فون پر بات نہیں کرتا تھا۔ اس بار وہ آدھ منٹ کے اندر اندر فون بند کر کے باہر آگیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات تھے کہنے لگا۔

”بریگیڈیئر پروین کو ہمارے حوالے کرنے پر تیار ہے۔“

میں نے اورنگ زیب کا ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔

”خدا کا شکر ہے ہمارا مشن ناکام نہیں ہوا“

ہم رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں پہاڑی ٹیلے کے ساتھ جا رہے تھے۔ وہ

”کچھ پتہ نہیں راستے میں کس قسم کے حالات پیش آجائیں۔ ہمیں اپنی طرف سے تھوڑی بہت تیاری کر کے نکلنا ہوگا۔“

کمانڈو رحیم بولا۔

”ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔“

اورنگ زیب نے کہا۔

”نہیں۔ زیادہ آدمی ہوں گے تو شک پڑ سکتا ہے۔ ہم دونوں ہی کافی ہیں۔“

نقاب والی سیاہ کمانڈو جریاں پہننے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم نے صرف پتلونیں اور جیکٹیں پہن لیں۔ احتیاط کے طور پر ساتھ کمانڈو چاقو اور آٹو میٹک پستولیں میگزین بھر کر رکھ لیں۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے جب میں اور کمانڈو اورنگ زیب ہم بریگیڈیئر کی بیٹی ارملاکرچی کو لے کر اپنی خفیہ کمیں گاہ سے نکلے۔ ہم نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے ایک چادر اس طرح اوڑھادی تھی کہ صرف اس کا تھوڑا سا چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ ساتھ چلا رہا تھا کیونکہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہونے کی وجہ سے وہ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ کمانڈو اورنگ زیب میرے ذرا آگے آگے چل رہا تھا۔

ہم غیر آباد پہاڑی علاقوں سے گزرتے ہوئے ایک خالی سڑک پر اوپر نکل آئے۔ ہماری ایک جانب ذرا نیچے شملے کی مال روڈ کی بتیاں، جگمگا رہی تھیں۔ کمانڈو اورنگ زیب وہاں آکر ایک چھوٹے سے رستے پر مڑ گیا یہاں کچھ فاصلے پر کوٹھیاں تھیں جن میں روشنی ہو رہی تھیں۔ ارملانے کہا۔

”میری آنکھوں کو کھول دیں پلیز!“

کمانڈو اورنگ زیب بولا۔

”تھوڑی دیر انتظار کرو۔“

ہم تنگ پہاڑی رستوں سے نکل کر ایک اور سڑک پر چڑھ آئے۔ یہ تھوڑی کشادہ اور پختہ سڑک تھی۔ اورنگ زیب نے مجھ سے کہا۔

”ہم اسے وہاں وہ جو سنگٹل کی روشنی ہے اس کے قریب چھوڑ دیں گے۔“

”ہم اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر رات کے وقت کوٹھڑی سے نکالیں گے اور شملہ سولن روڈ پر جا کر چھوڑ آئیں گے۔ وہاں سے شملے کا پہاڑی ریلوے اسٹیشن قریب ہی ہے۔ ارملادہاں سے گھر فون کر دے گی۔ اور اس کے گھر والے اسے آکر وہاں سے لے جائیں گے۔“

اپنی کمیں گاہ یعنی قبرستان والے مٹے کی کوٹھڑی میں آکر ہم نے کمانڈو رحیم کو بتا دیا کہ ارملاکو ہم آج رات آزاد کر رہے ہیں۔ پروین اپنے گھر سری نگر پہنچ گئی ہے۔ کمانڈو رحیم نے بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ یہ مجاہدین کشمیر اور کشمیری کمانڈوز کی بہت بڑی فتح اور بھارتی غاصب فوج کی شکست تھی۔

میں اور کمانڈو اورنگ زیب نیچے تہ خانے میں گئے اور ارملاکو بتایا کہ آج رات اپنے گھر پہنچا دی جائے گی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”تمہارے بدکردار درندہ فوجی کشمیر میں مسلمان کشمیری خواتین کے ساتھ جو بدترین سلوک کر رہے ہیں ہم نے تمہارے ساتھ ویسا سلوک نہیں کیا۔ اپنے باپ کو جا کر بتا دینا کہ تم گھر سے جس طرح اٹھائی گئی تھیں اسی طرح عزت آبرو کے ساتھ واپس آئی ہو اور کشمیری کمانڈو نے تمہارے ساتھ شریف اور بااخلاق انسانوں ایسا سلوک کیا ہے۔“

بنگالی لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”میں ایسے ہی جا کر کموں گی۔ تم لوگوں نے جس شرافت کا ثبوت دیا ہے۔ میں اسے کبھی فراموش نہیں کروں گی۔ تم لوگوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام دنیا کا سب سے اعلیٰ ترین مذہب ہے۔“

ہم نے بریگیڈیئر کی بیٹی ارملاسے کہا کہ وہ تیار رہے ہم رات کے شروع ہوتے ہی اسے یہاں سے لے کر چل دیں گے۔ وہ سارا دن بھی میں نے اورنگ زیب کے ساتھ کمانڈو رحیم کی کمیں گاہ میں گزارا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد ہم نے تیاری شروع کر دی کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

لیکن میری چھٹی حس یونہی بیدار نہیں ہوا کرتی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے بتا دیا تھا کہ کوئی زبردست مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ اب کمانڈو اورنگ زیب میرے آگے آگے ارملہ کو ساتھ لئے چل رہا تھا۔ ہم اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ یہ سادھو کوئی عام سادھو نہیں تھا بلکہ ملٹری انٹیلی جینس کا آدمی تھا اور اس نے جب پہلی بار ہمیں شیلے کی اوپر والی سڑک پر بجلی کے کھمبے کے قریب سے گزرتے دیکھا تھا تو ملٹری ہیڈ کوارٹر کو اسی وقت وائرلیس کے ذریعے اطلاع کر دی تھی کہ دو مشکوک آدمی ایک عورت کو لے کر شملہ سولن روڈ کی طرف جا رہے ہیں اور اسی لمحے ملٹری کمانڈو فورس کا مسلح دستہ جیپ میں سوار ہو کر شملہ سولن روڈ پر پہنچ گیا تھا اور انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا تھا اور گھیرے میں لئے سڑک کی دونوں جانب اندھیرے میں ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں صرف اس بات کا انتظار تھا کہ کب ہم بریگیڈیئر کی بیٹی کو اپنے سے الگ کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ہم پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دینی تھی۔ لڑکی کی موجودگی میں وہ ہم پر اٹیک کرنے کا خطرہ مول نہیں لیتا چاہتے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہم کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں بلکہ کمانڈوز ہیں اور ہم اس وقت لڑکی کو ہلاک کر دینے کی پوزیشن میں ہیں۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ کیونکہ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ خطرہ ہر قدم پر ہمارے قریب آ رہا ہے۔ میں نہ رہ سکا۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

”لڑکی کو چھوڑ کر واپس بھاگ چلو۔“

اس نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ ہم ریلوے سٹیشن کی بتی کے قریب آگئے تھے اور ایک جانب اوپر ریلوے لائن والی سرنگ کی بتی بھی نظر آنے لگی تھی۔ مجھے اپنی دائیں جانب سڑک کے نیچے جھاڑیوں میں ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی دبے پاؤں جھاڑیوں میں چل رہا ہو۔ میں رک گیا۔ کمانڈو اورنگ زیب مجھ سے چار پانچ قدم آگے ہو گیا تھا۔ وہ بھی رک گیا۔ اس نے لڑکی کو کچھ کہا اور جیسے ہی اسے چھوڑ کر واپس ہوا ہم پر چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں سڑک پر لیٹ گیا۔ میں نے جیب سے پستول نکال کر

پھر اس نے ارملہ سے کہا۔

”ہم اس وقت شملہ سولن روڈ پر سٹیشن کے قریب آگئے ہیں۔ آگے سٹیشن کے سگنل کی بتی ہے۔ ہم تمہیں وہاں چھوڑ دیں گے۔ تم اپنے گھر سٹیشن پر سے فون کر دینا۔ وہ لوگ تمہیں آکر لے جائیں گے۔“

ہم سگنل کی بتی کی طرف چلنے لگے۔ ذرا آگے گئے تھے کہ ایک سادھو سامنے سے آکر ہمیں گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ کس کی دھرم پتی ہے بالک؟“

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

”جاؤ بابا اپنا راستہ لو“

سادھو مسکراتا ہوا آگے چل دیا۔ اچانک مجھے یاد آگیا کہ جس وقت ہم اپنے ہائیڈ آؤٹ سے نکل کر پکی سڑک پر آئے تھے تو میں نے اس سادھو کو وہاں سے بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک طرف بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھا جا پ کر رہا تھا۔ مگر اس نے ہماری طرف بڑے غور سے دیکھا تھا۔ میں نے جب اس بات کا ذکر اورنگ زیب سے کیا تو وہ رک گیا۔ اس نے پلٹ کر سادھو جس طرف گیا تھا اس طرف دیکھا۔ مگر وہاں سادھو نہیں تھا۔ سڑک بالکل سیدھی تھی اور بجلی کے کھمبوں پر بلب بھی روشن تھے مگر سادھو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

میری چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ میں نے اورنگ زیب سے کہا۔

”دوست! مجھے کسی آنے والے خطرے کی بو محسوس ہو رہی ہے۔ لڑکی کو یہیں چھوڑ کر واپس چلتے ہیں۔“

مگر کمانڈو اورنگ زیب کو ابھی اتنا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ جتنا تجربہ میں اپنی کمانڈو زندگی میں حاصل کر چکا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے ابھی بیدار ہونا شروع نہیں کیا تھا۔ کہنے لگا۔

”کوئی عام سادھو ہوگا۔ یہاں اس قسم کے سادھو لوگ راستے میں عام مل جایا کرتے

ہیں۔“

مجھے کوارٹر گارڈ میں بند کرنے کے بعد ایک گھنٹہ تک کوئی نہ آیا۔ میری کلائی پر جو گھڑی بندھی ہوئی تھی وہ انہوں نے ابھی تک نہیں اتاری تھی۔ میرا کمانڈو چاقو بھی وہ لے گئے تھے۔ کوارٹر گارڈ کے باہر کوئی تین منٹ میں ایک اور مسلح فوجی آکر پہرے کی ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ فوجی تھوڑی تھوڑی دیر بعد سلاخوں میں جھانک کر مجھے دیکھ لیتا تھا کہ کہیں میں خود کشی کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ کوارٹر گارڈ میں ڈالنے سے پہلے ایک بھارتی کپٹن نے جو یقیناً میڈیکل کور کا ڈاکٹر تھا میرا منہ کھلوا کر میرے سارے دانتوں کا بھی معائنہ کیا تھا کہ کہیں میں نے دانتوں میں زہریلی ٹیوب تو چھپا کر نہیں رکھی ہوئی۔

دو گھنٹے کے بعد مجھے کوارٹر گارڈ میں سے نکال کر مسلح دستے کی حفاظت میں ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جہاں لوہے کے پلنگ پر ایک گدلا ایک موناکمبل اور ایک سرانہ پڑا تھا۔ باقی سارا کمرہ خالی تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھ روم تھا۔ اس کمرے کے باہر بھی سلاخوں والا دروازہ لگا ہوا تھا۔ باہر دو فوجی گارڈ کھڑے ہو گئے تھے۔ جو مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ چونکہ میں نے ہر اذیت کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا اس لئے پلنگ پر کمبل اوپر لے کر لیٹ گیا۔ کمرہ ٹھنڈا تھا۔ میں جلتے بلب کی روشنی میں دروازے کی سلاخوں اور باہر پہرے پر کھڑے بھارتی سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے مستقل طور پر اسی جگہ رکھا گیا اور اسی جگہ مجھے ٹارچر کر کے مجھ سے وہ راز معلوم کرنے کی کوشش کی گئی جو میں انہیں کبھی نہیں بتاؤں گا تو یہاں سے فرار ہونے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں کوئی تدبیر نہیں آرہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ساتھی کمانڈو اور نگ زیب کی طرف خیال چلا گیا۔ میں نے اسے زخمی ہو کر سڑک پر گرتے دیکھا تھا۔ خدا کرے کہ وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ مجھے اس بات کی تسلی بھی تھی اور خوشی بھی تھی کہ ہم نے جماد کشمیر کے بزرگ مجاہد حاجی ثناء اللہ ڈار کی بیٹی کو اس کے گھر پہنچا دیا ہے۔ آگے میرے ساتھ جو کچھ ہوتا تھا اس کی مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ تو ہر کمانڈو کے ساتھ ہوا ہی کرتا ہے۔ اور اس کے لئے کمانڈو کو ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

میرے ہاتھ پیچھے باندھ کر بٹھایا گیا تھا آگے جارہی تھی۔ دوسری فوجی جیب ہمارے پیچھے تھی۔ ان فوجیوں کی چال ڈھال اور باتیں کرنے کا انداز اور جس طرح انہوں نے دو سیکنڈ میں میرے ہاتھ پیچھے کر کے رسی باندھی تھی، اس سے میں نے فوراً اندازہ لگا لیا تھا کہ بھارتی کمانڈو فورس کے جوان ہیں۔

میرا خیال تھا کہ شاید مجھے بریگیڈیئر مکرمی کے پاس چہرہ شناسی کے لئے لے جایا جائے گا۔ لیکن جیسے اس کے بنگلے کو جانے والی سڑک کے آگے سے گزر گئیں۔ یہ لوگ مجھے جاٹ رجمنٹ کے گیریزن میں لے گئے۔ مجھے کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا گیا۔ چھت کے ساتھ ایک بلب روشن تھا۔ سلاخوں والے دروازے کے باہر چاق و چوبند ملٹری پولیس کا مسلح فوجی اٹن شن ہو کر کھڑا تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ جو کچھ تھا وہ تلاشی کے بعد نکال لیا گیا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے لمبے پنج پر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے۔ سوچنے لگا یہاں سے فرار کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ دشمن کی قید سے فرار ہر فوجی اور ہر کمانڈو کا حق ہوتا ہے۔ عام جنگی قیدی ایسے بھی ہوتے ہیں جو فرار کا خطرہ مول لینے کی بجائے دشمن کی قید میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کر قید کی ساری مدت گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس کمانڈو ایسا کبھی نہیں سوچتا۔ کمانڈو کو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ کمانڈو کسی بھی ملک کی فوج کا وہ جوان ہوتا ہے جس کی تربیت پر لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔ جس کے پاس اپنی رجمنٹ اور پورے ڈویژن کی اور جہاں جہاں اپنی فوج ڈپلائے ہوتی ہے اس کے بارے میں پوری معلومات ہوتی ہیں اور اس کے علاوہ بعض ایسے فوجی راز بھی ہوتے ہیں۔ جو ایک عام فوجی کو معلوم نہیں ہوتے۔ کمانڈو اول تو دشمن کے قابو نہیں آتا۔ اگر کسی اپنی غلطی یا بد قسمتی کے باعث دشمن کے ہتھے چڑھ بھی جائے تو وہ دشمن کی قید میں آتے ہی فرار کی تدبیریں سوچنے لگتا ہے۔ عام جنگی قیدی کی نسبت کمانڈو کی سیکورٹی زیادہ سخت ہوتی ہے اور دشمن اس پر ہر طرح کا تشدد کرتا ہے تاکہ اس سے جس قدر اہم فوجی راز معلوم کئے جاسکتے ہیں کئے جائیں۔

گڑھ والا بھارتی ایٹمی سنٹر تباہ کیا تھا اور وہ میں ہی تھا جو احمد آباد میں را کے چیف کے گھر ہندو جین جوگی بن کر رہ رہا تھا اور اس کی بیٹی میناکشی پر اپنا اثر ڈال کر میں نے بھارت کی تخریب کار پاکستان دشمن ایجنسی را کے خفیہ راز معلوم کئے تھے۔ ان کے علاوہ میرے عزیز شہ کئی نامہ اعمال میں ملٹری انٹیلی جینس کو چونکا دینے کے لئے اور بھی بہت کچھ تھا۔ مجھے یہ پروا نہیں تھی کہ بھارت کی ملٹری انٹیلی جینس کو میرا سارا کچا چٹھا معلوم ہو جائے گا۔ فکر صرف یہ تھی کہ ان تمام رازوں کے فاش ہو جانے کے بعد ان پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ میں ایک انتہائی قیمتی اور خطرناک کمانڈو ہوں جس کی سرگرمیاں صرف کشمیر تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ سارے بھارت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد وہ مجھے کسی حالت میں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے اور کسی ایسے اندھے کنوئیں میں ڈال دیں گے جہاں سے میری کمانڈو ٹریننگ اور تجربہ بھی باہر نہ نکال سکے گا۔

دو ملٹری پولیس کے جوان آئے اور مجھے ایک فوجی افسر کے پاس لے گئے۔ چھوٹے سے کمرے میں یہ فوجی افسر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کے پیچھے دیوار پر بھارت کے وزیر اعظم شاستری کی فوٹو لگی تھی۔ جہوں کشمیر کے نقشے کا ایک چارٹ لگا تھا۔ کمرے کے آئینہ میں دھیمی دھیمی آگ روشن تھی۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ قید خانے کے ٹھنڈے کمرے سے یہاں آکر مجھے بڑا سکون محسوس ہوا۔ میرے ہاتھ کھلے تھے۔ مسلح فوجی جوانوں نے کمرے میں آکر سیلوٹ کیا اور اٹن شن کھڑے ہو گئے۔ فوجی افسر کے کاندھے پر ایک کراؤن لگا تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میجر ریک کا افسر ہے۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ پھر فوجیوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ چلے گئے تو یہ بھارتی میجر مجھے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور سمجھ گیا کہ مجھ پر پیار محبت کی پالیسی اختیار کی جا رہی ہے۔

انڈین میجر نے دراز میں سے سگریٹ کیس نکال کر مجھے سگریٹ پیش کیا۔ میں نے کہا۔

”شکریہ“

ساری رات گزر گئی۔

شملے کی اس فوجی چھاؤنی کے جس کمرے میں مجھے بند کیا گیا تھا اس کی سلاخوں میں سے دن کی روشنی اندر آنے لگی تھی۔ رات کسی وقت گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لئے میری آنکھ لگ گئی تھی۔ باہر گارڈ بدل چکی تھی۔ کوئی دوسرے سپاہی باہر گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک گور کھا تھا۔ فوجی پیرے میں مجھے ہاتھ روم لے جایا گیا۔ واپس آیا تو ایک بھارتی فوجی میرے لئے چائے کا مک اور ڈبل روٹی لے کر آگیا۔ اس نے مجھ پر ایک قر آلود نظر ڈالی اور پلنگ پر ایک طرف چائے کا مک اور ڈبل روٹی رکھ کر چلا گیا۔ آہنی سلاخوں والا دروازہ لاک کر دیا گیا۔ میں نے ڈبل روٹی کے ساتھ چائے پی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ اپنے حسن سلوک کے ساتھ مجھے متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ تشدد کا یہ بھی ایک طریقہ ہوتا ہے کمانڈو کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ اسے ہر طرح کا لالچ دیا جاتا ہے۔ یہ کام پیشہ ور چالاک عورتوں سے بھی کڑوا جاتا ہے۔ میں اس قسم کے تمام حربوں سے واقف تھا۔ مجھے کوئی فکر تھا تو صرف اس بات کا کہ اگر انہوں نے میری فائل کھولی یا انہیں میرا پچھلا ریکارڈ معلوم ہو گیا تو ان کو میرے سارے پچھلے کمانڈو ایکشن کی تباہی کا علم ہو جائے گا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں نے ہی دوار کا کافوجی ایمونیشن ڈمپ اڑایا تھا۔ میں نے ہی بھوپال بمبئی لائن پر فوجی گاڑی کو دھماکے سے اڑا دیا تھا اور میں نے ہی ڈا ٹریننگ سنٹر کے تجربہ کار کافر دہشت گردوں کو ہلاک کیا تھا جو پاکستان دہشت گردی کے لئے جا رہے تھے۔ اور میں نے ہی ارجن سنگھ سوڈھی کے بھیس میں راجستھان میں را

ہم تھا کہ میں نے پاکستانی کمانڈو کی حیثیت سے کمانڈو ایکشن کے ذریعے کہاں کہاں ان
دشمنوں کو شدید نقصان پہنچایا ہے لیکن اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ جس کمانڈو سے
وہ یہ ساری باتیں کر رہا ہے وہ کس مٹی کا بنا ہوا ہے اور وہ قوت یلغار یعنی انٹیک اور قوت
دفاعت کی کس قدر حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہے۔

میں نے بڑے سکون کے ساتھ کہا۔

”میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے اپنے حریت پرست ساتھیوں کے بارے میں کوئی علم
نہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ مجھے شملے میں اس خفیہ ہائیڈ آؤٹ سے واقفیت نہیں۔
جہاں ہم نے بریگیڈیئر مکرجی کی بیٹی کو اغوا کرنے کے بعد چھپایا تھا۔ میں آپ کو صرف اتنا
بتانا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں میری زبان بند ہے۔ میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اور
میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھ سے میرے ساتھی حریت پرستوں کے نام اور ٹھکانے
معلوم کرنے کے سلسلے میں آپ کے سارے حربے ناکام ہو جائیں گے۔“

میجر دیوان چند میز کے کنارے پر سے اٹھا اور اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ الیش
زے میں مسل کر کہنے لگا۔

”ٹھیک ہے اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے کرنے پر مجبور
ہوں جو تم سے یہ سارے راز اگلوانے میں شاید پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگائیں گے۔“

اس نے میز پر رکھی گھنٹی بجائی۔ ملٹری پولیس کے وہی دو فوجی جوان اندر آگئے۔ میجر
نے کہا۔

”اسے واپس لے جاؤ۔“

انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑا اور لا کر پھر اسی ٹھنڈے بند کمرے میں ڈال دیا۔
میں لوہے کے پلنگ پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ میں نے کبل گھنٹوں پر کر لیا اور سوچنے لگا کہ
ٹھ پر نارچہ اور غیر انسانی اذیتوں کا دروازہ کھلنے والا ہے۔ مجھے ابھی سے اس کی تیاری
شروع کر لینی چاہئے اس کے لئے سانس کی کچھ مشقیں تھیں جو مجھے میرے ہوشنگ آباد
ننگ سنٹر والے کمانڈو استاد نے بتائی تھیں۔ ان ورزشوں سے نارچہ کی تکلیف غائب

”تم جانتے ہو کہ یہ تمہاری ہی تصویریں ہیں۔ تم یہ بھی جان چکے ہو کہ ہماری انٹیلی
جینس کو تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ کسی چیز کو چھپانے سے تمہیں
سوائے نارچہ کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں ایک ملٹری انٹیلی جینس آفیسر کی حیثیت سے
سمجھتا ہوں کہ تم نے جو کچھ کیا تمہیں ایک کمانڈو سپاہی کی حیثیت سے یہی کرنا چاہئے تھا۔
یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس عہدے پر میں میجر دیوان چند تعینات ہوں میری جگہ اگر
کوئی دوسرا فوجی افسر ہوتا تو وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی تم پر گھونسلوں اور ٹھنڈوں کی
بارش کر دیتا اور تم اس وقت لمولمان ہو کر فرش پر پڑے ہوتے۔ لیکن میں انصاف پسند
فوجی افسر ہوں۔ میں نے تم سے بہتر سلوک کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی مجھ سے
تعاون کرو۔“

میں نے پوچھا۔

”آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟“

میجر دیوان چند کرسی چھوڑ کر آتشدان کے پاس چلا گیا۔ اس کی پشت آتشدان کی
طرف تھی۔ سگریٹ اس کے منہ میں سلگ رہا تھا۔ اس نے سگریٹ منہ سے نکال کر ہاتھ
میں پکڑا اور میرے قریب آکر میز پر اس طرح بیٹھ گیا کہ اس کا چہرہ میرے چہرے کے
قریب آگیا تھا۔ بڑی دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

”میں تم سے تمہاری پچھلی تخریبی کارروائیوں کا حساب نہیں مانگوں گا۔ میں تم سے
یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ راجتھان، احمد آباد اور دلی میں تم کن لوگوں کے پاس ٹھہرے
ہوئے تھے۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ شملے میں تمہارا ہائیڈ آؤٹ کہاں تھا؟ تم نے
بریگیڈیئر صاحب کی بیٹی کو کہاں رکھا تھا اور شملے میں تمہارے کون کون سے ساتھی کن
جگہوں پر کام کر رہے ہیں۔ میں تمہیں اپنے طور پر یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم نے ہمیں
اپنے کمانڈو ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتا دیئے اور وہ ہماری تحویل میں آگئے تو میں خود
تمہیں اپنی حفاظت میں انڈیا کا بارڈر کراس کر کر پاکستان پہنچا دوں گا۔“

میں دل میں ہنس رہا تھا۔ اس بھارتی ملٹری انٹیلی جینس افسر کو یہ تو سب کچھ معلوم ہو

بھینچ کر باہر نکال دیتے ہیں۔ یوں ہم اپنے پھیپھڑوں اور اپنے جسم کو اس آکسیجن سے محروم کر دیتے ہیں۔ جس کا ہر سانس کے ساتھ ہمارے جسم کے کوئے کوئے تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ ہندو جوگیوں نے اس فن میں بڑی مہارت حاصل کی ہے۔ یاد رکھیں جو ہوا ہم سگریٹ سگار یا پائپ کے تمباکو کے ساتھ کش لگاتے وقت اپنے پھیپھڑوں میں داخل کرتے ہیں اس ہوا کی آکسیجن میں نکوٹین اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کا زیادہ سے زیادہ حصہ شامل ہو جاتا ہے۔ اس کی آکسیجن بھی صحت کے لئے مضر ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمانڈو ٹریننگ کے آغاز میں اگر کسی کمانڈو کیڈٹ کو سگریٹ کی عادت ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس کے سگریٹ چھڑوائے جاتے ہیں۔ کیونکہ سگریٹ پائپ یا سگار کے کش کے ساتھ ہوا پھیپھڑوں میں داخل کرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ دودھ میں تھوڑا تھوڑا زہر ملا کر پی رہے ہوں۔ یہاں میں اپنے پاکستانی نوجوانوں کو خاص طور پر ہدایت کروں گا بلکہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو انسٹرکٹر کی حیثیت سے حکم دوں گا کہ وہ اپنے آپ کو سگریٹ اور شراب ایسی قاتل چیزوں سے ہمیشہ دور رکھیں۔ ایسی جگہوں پر بھی نہ بیٹھیں جہاں لوگ سگریٹ یا شراب پی رہے ہوں۔ کیونکہ وہ میرے وطن پاکستان کے محافظ ہیں۔ پاکستان کے سپاہی ہیں۔ ان پر وطن پاک کے تحفظ کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ پاکستان ہمارا وہ وطن ہے جس کی خاطر ہمارے بزرگوں نے ایسی ایسی قربانیاں دی ہیں کہ ان کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ ہمارے نوجوانوں کو ان قربانیوں کی مثال کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا ہے۔ اور ایک پاکستانی ذمہ دار شہری بہادر وطن پرست سپاہی اور دلیر اور جاں باز کمانڈو بن کر دشمن کے خلاف سیسہ پلائی دیوار ثابت ہونا ہے اور اپنے وطن پاک کی حفاظت کرنی ہے۔ یہ کوئی نصیحت نہیں ہے کہ چاہے ہماری نئی نسل کا نوجوان مانے چاہے نہ مانے۔ نہیں یہ ان کا ایک محب وطن پاکستانی اور مسلمان ہونے کے ناطے فرض ہے۔ اور انہیں اپنا فرض اسی طرح نبھانا ہے جس طرح زندہ اور آزاد قومیں اپنا قومی فرض نبھاتا کرتی ہیں۔ یاد رکھیں۔ قوموں کی عالمی تاریخ گواہ ہے۔ صرف وہی قومیں عزت و آبرو سے زندہ و پابند رہ کر ترقی کرتی ہیں جو اپنے قومی فرائض کو دیانت داری اور سرفروشی سے نبھاتی ہیں۔ جو

نہیں ہوتی تھی صرف اتنا ہوتا تھا کہ تربیت یافتہ کمانڈو اس کو مردانہ وار برداشت کرنے کے قابل ہو جاتا تھا۔ ان میں سے سب سے اہم ورزش سانس کو اندر کھینچ کر زیادہ سے زیادہ روکنے اور پھر منہ کے راستے سانس کو آہستہ آہستہ باہر نکالنے کی تھی۔ آپ کو پڑھنے سننے میں یہ ورزش بڑی آسان لگے گی لیکن یہ ورزش سب سے زیادہ مشکل ہے۔ کبھی آپ اسے کر کے دیکھیں۔ آپ زور سے بھرپور سانس اندر کو کھینچ کر ناک منہ بند کر لیں۔ کوشش کریں کہ جو ہوا آپ کے پھیپھڑوں میں گئی ہے اسے زیادہ سے زیادہ اندر رکھیں۔ اس ہوا میں جو آکسیجن ہوگی اسے آپ کے پھیپھڑے جذب کر کے خون کے حوالے کر دیں گے۔ ایک منٹ کے بعد آپ کو دم گھٹنا محسوس ہوگا۔ آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگے گا۔ آپ جلدی سے منہ کھول دیں گے تازہ سانس لیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کا سانس تیز ہو گیا ہے۔ آپ اس طرح ہانپنے لگیں گے جیسے آپ دوڑ لگا کر آئے ہیں۔ آپ جلدی جلدی سانس لینے لگیں گے۔ بس یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جس کے لئے ایک کمانڈو کو تربیت دی جاتی ہے۔ اس وقت کمانڈو کو اپنے سانس پر قابو پانا ہوتا ہے۔ اس وقت تیز تیز سانس لینے کی بجائے اسے فوراً سانس اندر کھینچ کر تازہ ہوا کو پھیپھڑوں میں بھر کر منہ ناک بند کر لینے ہوتے ہیں۔ اس لمحے سانس باہر کو آنے کے لئے سخت جدوجہد کرے گا۔ لیکن ہمیں سانس کو زیادہ سے زیادہ دیر اپنے سینے میں بند رکھنا ہوگا۔ جب آنکھوں کے آگے تاریے ناچنے لگیں تو سانس کو آہستہ آہستہ باہر نکالنا ہوگا۔ جو آپ تجربہ کر کے دیکھیں بہت مشکل کام ہوگا۔ اسی طرح ہر بار یہ مشق کرنی ہوگی۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس سے کیا ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے بھی اپنے سانس پر غور ہی نہیں کیا کہ ہم یہ کیا کر رہے ہیں اور اس سانس کے ذریعے جو آکسیجن ہمارے اندر جاتی ہے وہ اندر جا کر کیا کرتی ہے۔ یقین کریں ہم میں سے ننانوے فی صد لوگ ایسے ہیں جو ٹھیک طرح سے سانس لیتا نہیں جانتے۔ سانس لینے وقت ہمارے پھیپھڑوں میں پوری ہوا نہیں جاتی۔ ہمارے پھیپھڑوں کا زیادہ حصہ سکڑا ہوا رہ جاتا ہے اور وہاں تک آکسیجن بالکل نہیں پہنچتی۔ ہم پھیپھڑوں کے اوپر اوپر سانس

دہائے فاتحہ پڑھنا تھی۔ لیکن آخر میں بھی ایک عام انسان تھا۔ کوئی ولی اللہ نہیں تھا۔ دل میں کسی کمزوری کے لمحے پریشان کر دینے والے خیال بھی آنے لگتے تھے۔ بس میری اگر کوئی خوبی تھی تو صرف اتنی کہ میں خدا کی وحدانیت اور اس کے مالک ارض و سماء ہونے کے تصور سے ان کمزور اور پریشان کر دینے والے خیالات کو پسپا کر دیتا تھا۔ بھگا دیتا تھا۔ اور میں آپ کو اپنے دل کی بات بتاتا ہوں کہ یہ خوبی بھی میرے اندر خدائے بزرگ و برتر کے فضل و کمال کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ورنہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا۔ فوجی ہیلی کاپٹر اڑا جا رہا تھا۔ اس کی آواز کا شور کافی تھا۔ اور اندر جو چار پانچ انڈین فوجی بیٹھے تھے انہیں ایک دوسرے سے اونچی آوازوں میں بات کرنی پڑتی تھی۔ ان فوجیوں کے لہجے ڈوگری اور گڑھوالی زبان کے تھے۔ صرف آگے کی طرف کوئی فوجی مانجھے کی پنجابی زبان میں بات کرتا تھا۔

ابھی تک مجھ پر ذرا سا بھی تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن بہت جلد قیامت خیز وحشیانہ تشدد کا دروازہ کھلنے والا تھا۔ لیکن یقین کریں کہ مجھے ان کے وحشیانہ تشدد کی کوئی پروا نہیں تھی۔ صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ جب ٹارچر کے باوجود وہ مجھ سے کوئی معلومات حاصل نہ کر سکیں گے تو مجھے شوٹ کر دیں گے۔ ڈر موت کا نہیں تھا۔ بلکہ اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرنے کے بعد میں پاکستان دشمن بھارتی فوجیوں کے خلاف بھارت اور کشمیر میں اپنی مجاہدانہ کارروائیاں جاری نہ رکھ سکوں گا۔ جب کہ میں پاکستان اور کشمیریوں کے انڈی دشمن کے خلاف اپنی فتح تک جنگ جاری رکھنا چاہتا تھا اور اپنی کمائڈو سرگرمیوں سے اس کے پاکستان اور آزادی کشمیر کے خلاف مذموم عزائم کو ہر محاذ پر شکست دینا چاہتا تھا۔

ہیلی کاپٹر ایک دم نیچے کو جھکنے لگا۔

پھر اس نے ایک غوطہ لگایا اور کسی مقام پر اتر گیا۔ مجھے دور سے فوجی گاڑیوں اور لوگوں کے ایک دوسرے سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے پکار کر ہیلی کاپٹر سے اتارا گیا۔ کسی گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی چل پڑی۔ گاڑی بڑی ہموار سڑک پر چل رہی تھی اور اس کی آواز بڑے ٹرک کے انجن کی آواز تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میں کسی

معلومات کا تعلق تھا شملے میں کوئی ہوائی اڈہ نہیں تھا۔ جب ایک خاص آواز کا شور بلند ہونے لگا تو میں سمجھ گیا کہ مجھے کسی فوجی ہیلی کاپٹر میں سوار کرایا گیا ہے۔ دوسرے دن مجھے اپنا آپ ہوا میں بلند ہوتا محسوس ہوا۔ ہیلی کاپٹر فضا میں اوپر اٹھ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر نے ایک خاص بلندی پر جا کر دائیں جانب غوطہ سا لگایا اور پھر ایک چکر کاٹ کر بالکل سیدھا ہو گیا۔ ہیلی کاپٹر اب بالکل سیدھا میں جا رہا تھا۔

جانے کیوں مجھے راجستھان کی پرانی مڑھیوں میں ملنے والی چند ریکا کی بدروح کا خیال آگیا۔ اس نے آخری ملاقات میں مجھے دھمکی دی تھی کہ چونکہ میں نے اس کی بھارت مارت کے دلش کے فوجی ٹھکانوں اور میزائل کے اڈوں کو تباہ کرنا شروع کر دیا ہے اس لئے وہ مجھ سے ایسا بدلہ لے گی کہ جسے میں ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گا۔ آپ نے پیچھے میری داستان میں پڑھا بھی ہو گا میں نے اس بدروح چند ریکا کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ار کے ساتھ ہی مجھے دلی میں نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ شریف کے قریبی قبرستان میں دفن کسی گنہگار مگر پارہ سار اور نیک دل مغل شہزادے کی روح کا خیال بھی آیا جس نے عالم در میں میرے سامنے آکر مجھے خبردار کیا تھا کہ عنقریب مجھ پر ایک بہت بڑی آفت نازل ہوئے والی ہے۔ میں قدرتی طور پر سوچنے لگا کہ کہیں یہی تو وہ آفت نہیں ہے کہ میرا سارا بچا فاش ہو چکا ہے اور میں بھارتی ملٹری انٹیلی جینس کی قید میں ہوں اور مجھے کسی نامعلوم منزل کی طرف ٹارچر کرنے کے لئے لے جایا جا رہا ہے؟

طرح طرح کے خیال مجھے آنے لگے تھے۔ بدروح چند ریکا کی بددعا کا دھمکی کا مجھ اس لئے بھی زیادہ اثر نہیں ہوا تھا کہ میرے اندر ایمان کی اتنی طاقت تھی اور میں اپنے اندر خدا اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھنے والے ایک مسلمان کی حیثیت سے آتا تو اتنی محسوس کر رہا تھا کہ چند ریکا ایسی ہزار بدروہیں بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں لیکن مغل شہزادے کی نیک روح کی پیش گوئی سے میں ضرور کسی وقت پریشان ہو جاتا اگرچہ شہزادے کی نیک روح نے مجھے اس آفت سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ بھی دیا تھا کہ مجھے نجیب آباد کے قلعہ پتھر گڑھ کے مشرق میں شہید خاتون کے مزار پر جا

روانہ ہو گئی۔ پٹی کی وجہ سے میری آنکھیں درد کرنے لگی تھیں۔ میں نے اپنے گاڑی سے کہا کہ میری آنکھوں کی پٹی ذرا نرم کر دی جائے۔ اس کے جواب میں اس نے زور سے ہنسی میری پسلیوں میں ماری اور کہا۔
”چپ بیٹھے رہو“

یہ کسی بڑے شہر کا ایئر پورٹ تھا۔ اس کا قیاس میں نے یوں لگایا کہ جب ہماری گاڑی ایئر پورٹ سے نکل رہی تھی تو گاڑیوں کی ادھر ادھر سے آنے جانے کی کافی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے بعد کبھی کبھی کسی گاڑی کے قریب سے نکل جانے کی آواز آجاتی۔ معلوم ہوا کہ ہم کسی بڑے شہر کی سڑک پر جا رہے ہیں۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ انڈیا کا یہ کونسا شہر ہے۔ انبالے سے دو ڈھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد دلی کے ارد گرد کوئی بھی شہر ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا۔ یہ دلی کا شہر ہی ہو۔ لیکن میں بھارت کے تمام شہروں اور ان کے درمیانی فاصلوں سے تقریباً واقف ہو چکا تھا۔ انبالے سے دلی اتنا دور نہیں تھا کہ ایک کم رفتار والا فوجی طیارہ بھی دو اڑھائی گھنٹے تک سفر کرتا رہے۔ اگر مجھے شملے سے انبالے لایا گیا ہے تو ظاہر ہے بھارتی فوجی مجھے جنوبی بھارت کے کسی شہر میں لے جا رہے ہیں۔ جنوبی بھارت اتنے فضائی فاصلے پر کان پور مشرق کی طرف، امرتسر مغرب کی طرف اور جنوب کی طرف بھوپال جھانسی کی کوئی فوجی چھاؤنی ہی ہو سکتی تھی۔ میں دل میں قیاس آرائیاں کر رہا تھا اور گاڑی اب جن سڑکوں پر گزر رہی تھی وہاں کسی دوسری گاڑی کے گزرنے کی باہر سے آواز نہیں آرہی تھی۔ یہ کوئی سنسان اور غیر آباد علاقہ تھا۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ گاڑی ایک نشیب میں سے گزر کر دائیں طرف مڑی تو اس کی رفتار کم ہو گئی۔ کسی بڑے گیٹ کے کھلنے کی آواز سنائی دی۔

گاڑی جیسے گیٹ کے اندر داخل ہونے کے بعد ایک طرف گھوم کر رک گئی۔ مجھے گاڑی سے نکال کر فوجی گاڑی مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔ اس کے بعد ایک کمرے میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے کہا۔
”بیٹھ جاؤ“

ایئر پورٹ کے رن وے پر ہوں۔ ایک جہاز کے انجنوں کی آواز آئی۔ وہ گرجتا ہوا ٹیک آف کر رہا تھا۔ جہاز کے اترتے اور چڑھتے وقت انجنوں کی آواز کے فرق کو میں بخوبی پہچانتا تھا۔ میرا قیاس غلط نہیں تھا۔ میں کسی ایئر پورٹ کے اندر تھا اور مجھے ہوائی جہاز کے ذریعے وہاں سے انڈیا کے کسی دوسرے شہر لے جایا جا رہا تھا۔ جب مجھے گاڑی میں بٹھا کر لے جایا جا رہا تھا تو میرے قریب بیٹھے ہوئے (وہ فوجی وہ فوجی ہی ہو سکتے تھے) آپس میں انگریزی میں باتیں کرنے لگے۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ یہ انبالے کا فوجی ہوائی اڈہ ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے شملے سے فوجی ہیلی کاپٹر کے ذریعہ انبالے لایا گیا تھا اور اب وہاں سے کسی فوجی طیارے میں بٹھا کر کسی نامعلوم مقام کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

میری آنکھوں کی پٹی ابھی تک نہیں اتاری گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میری آنکھوں پر پٹی باندھنے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کے کسی فوجی ایئر پورٹ کو دیکھوں میرا خیال ہے اس معاملے میں وہ حق بجانب تھے۔ یہاں مجھے کسی طیارے میں سوار کرا دیا گیا۔ طیارہ ٹیک آف کر گیا۔ طیارے کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ زیادہ بڑا طیارہ نہیں ہے اور کوئی درمیانی قسم کا فوجی طیارہ ہے۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے فوجی سے کہا کہ میں ہاتھ روم جانا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور چند قدم پیچھے کی جانب چلا کر ایک دروازے کے اندر دھکیل دیا۔ میں نے اندر آنے کے بعد دیواروں کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا کہ ہاتھ روم بہت ہی چھوٹا ہے۔ فوجی نے مجھے اندر دھکیلنے سے پہلے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

”آنکھوں کی پٹی مت کھولنا۔ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں گا۔“

میں نے بڑی مشکل سے ہاتھ روم میں تھوڑا سا وقت گزارا اور باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی بلکہ دروازہ کھولتے ہی فوجی نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور مجھے میری سیٹ پر لا کر بٹھا دیا۔ یہاں مجھے کچھ کھانے پینے کو دیا گیا۔ یہ طیارہ کچھ نہیں تو میرے اندازے کے مطابق دو ڈھائی گھنٹے تک فضا میں اڑتا رہا۔ پھر اس نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ جہاز لینڈ کر گیا۔ یہاں سے اسی طرح ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی کسی نہ معلوم منزل کی طرف

سفید کپڑے والوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے سٹریچر پر لٹا دیا۔ سٹریچر کی دونوں جانب لوہے کی زنجیریں تھیں۔ میرے ہاتھ پاؤں ان زنجیروں سے سٹریچر کے ساتھ جکڑ دیئے گئے پھر میری پتلون اتار دی گئی۔ اور ٹارچر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

میں ٹارچر کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ انہوں نے مجھے جس طرح ٹارچر کیا اور جیسی جیسی اذیتیں دیں اس کا آپ شاید تصور بھی نہ کر سکیں۔ میں نے اپنے اوپر ٹرننگ کے مطابق کسی حد تک بے حسی کی حالت طاری کر لی تھی مگر جب نشتر آپ کے جسم کے نازک حصوں میں چبھوایا جائے اور بجلی کے جھٹکے دیئے جائیں تو یہ بے حسی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میری ٹرننگ بھی مجھے اذیت کی تکلیف سے نہ بچا سکی تھی۔ سٹریچر کا ہینڈل گھما کر اسے ٹانگوں کی جانب سے اونچا کر دیا گیا تھا۔ یہ لوگ بڑے سائنٹیفک طریقوں سے ٹارچر کر رہے تھے۔ جب درد ناقابل برداشت ہو جاتا تو یقین کریں میری چیخ نکل جاتی۔ درد اس سے بھی آگے گزر جاتا تو میں بے ہوش ہو جاتا۔ مجھے کوئی دوا سکھا کر فوراً ہوش میں لایا جاتا۔ ہر بار ہوش میں لائے جانے کے بعد مجھ سے کہا جاتا۔

”اگر اب بھی تم اپنے ساتھیوں کے نام ٹھکانے بتا دو گے تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ یاد رکھو۔ اگر تم نے زبان بند رکھی تو یہاں سے زندہ باہر نہ جاسکو گے۔“

مگر میں ہر بار درد سے کراہتے ہوئے یہی کہتا۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں میں اکیلا ہوں۔“

خدا جانے کب تک ٹارچر کا سلسلہ جاری رہا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کے بعد مجھے دو فوجیوں نے اٹھایا اور اسی پہلے والے کمرے میں لا کر ڈال دیا۔ میں خدا جانے کتنی دیر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا۔ پھر ذرا ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا بدن اکڑ گیا ہے۔ پیٹ پر ناف کے نیچے درد ہو رہا تھا۔ میں لیٹے لیٹے ہاتھ نیچے لے گیا۔ جہاں مجھے نشتر چھوئے گئے تھے۔ وہاں ایک لمبی ٹیپ لگی ہوئی تھی۔ سر پتھر بن گیا تھا۔ ہاتھوں میں سونیاں سی چھ رہی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے کلائی اٹھا کر وقت دیکھنا

چاہا۔ میری کلائی کی گھڑی غائب تھی۔ چھت پر بلب جل رہا تھا۔ میری رانوں پر بجلی کے جھٹکے دیئے گئے تھے۔ ٹانگیں سن ہو رہی تھیں۔ میں نے پاؤں ذرا سے ہلائے۔ پاؤں ہلنے لگے۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ میری ٹانگوں میں جان باقی تھی۔

پھر دو آدمی اندر آئے۔ میں نے اپنی بند ہوتی آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ دونوں نے ڈاکٹروں والے سفید کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ مگر یہ وہ آدمی نہیں تھے جنہوں نے مجھ پر تشدد کے درندہ صفت حربے آزمائے تھے۔ انہوں نے مجھے کوئی انجکشن لگایا اور چلے گئے۔ انجکشن لگنے کے بعد میرے جسم میں طاقت سی آگئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ میرے بدن پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ صرف ناف کے نیچے جہاں نشتر زنی کی گئی تھی دوائی والی ٹیپ لگی تھی۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ میں نے اپنی ٹانگوں کو دبایا۔ ٹانگوں میں زندگی کی حرارت آہستہ آہستہ واپس آرہی تھی۔ اس کے بعد مجھے کھانا دیا گیا۔ ٹین کے مک میں سبزیوں کا سوپ تھا۔ ساتھ دو روٹیاں تھیں۔ میں نے کھانا زہر مار کیا اور لیٹ کر خدا کو یاد کرنے لگا۔ وقت کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ دن کتنا گزر گیا ہے۔ کمرہ بند تھا۔ اس میں کوئی کھڑکی روشن دان نہیں تھا۔ دیواریں خالی تھیں۔ صرف چھت والا بلب جل رہا تھا۔ دروازہ کھلا تو مجھے باہر برآمدے میں بھی بلب کی روشنی دکھائی دی۔ جس سے معلوم ہوا کہ باہر رات ہو گئی ہے۔

ایک فوجی میرے لئے کھانا لایا تھا۔ مک میں پانی تھا۔ تھالی میں دو روٹیاں تھیں جس پر دال رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس فوجی سے وقت پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور تھالی مک میرے آگے رکھ کر چلا گیا اور دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ وہ رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن جب مجھے چائے کے ساتھ ایک مکھن بند لا کر دیا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ دو سرا دن چڑھ آیا ہے۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ مجھے صبح شام کھانا پانی دیا جاتا تھا۔ میرے پیٹ پر جو زخم لگے تھے ان کی درد کم ہو گئی تھی۔ بدن میں بھی توانائی واپس آگئی تھی۔ دو دن کے بعد مجھے ایک بار پھر اسی ٹارچر چیمبر میں لے جایا گیا اور ٹارچر کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اذیت کا یہ مرحلہ پہلے سے زیادہ بھیانک اور انتہائی تکلیف دہ تھا۔ میں آپ

پیل میں لے جا رہے تھے۔ جیپ چاروں طرف سے بند تھی۔ کچھ پتہ نہیں تھا مجھے کہاں کہاں سے گزار کر کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ ابھی تک مجھے یہ بھی علم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ بھارت کا کونسا شہر ہے۔ کون سے شہر کی چھاؤنی کا فوجی کیمپ ہے۔ میں ویسے بھی ان باتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے یہ ساری زندگی مجھے ٹارچہ کرتے رہیں میں ان کا تشدد برداشت کرتا رہوں گا۔ مگر اپنی زبان نہیں کھولوں گا۔

باہر کی خوشگوار تازہ ہوائ نے میرے جسم کو تھوڑا سا سکون دیا تھا۔ میں نے ایک دو بار آنکھیں کھول کر جیپ کی تہپال میں بنے ہوئے چوکور روشن دان کی طرف دیکھا۔ درخت ہی درخت پیچھے کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سر تہپال کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ فوجی جیپ کافی دیر تک چلتی رہی۔ پھر ایک جگہ رک گئی۔ جیپ کا پچھلا دروازہ کھلا۔ وہاں پہلے سے دو مسلح فوجی کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ میں نے نیلی وردی والے ایک آدمی کو بھی دیکھا۔ اس کی وردی سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ ضرور انڈین ایئر فورس کا آدمی ہے۔ مجھے کھینچ کر جیپ سے باہر نکالا گیا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک چھوٹے سے ایئر پورٹ کے کنٹرول ٹاور کے پاس کھڑا ہوں۔ دور کچھ فاصلے پر انڈین ایئر فورس کا ایک طیارہ کھڑا تھا۔ سفید اور نیلے رنگ کی ایک دوسری جیپ تیزی سے آکر ہمارے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس کو ایئر فورس کا ایک آدمی چلا رہا تھا۔ میرے ساتھ تین انڈین آرمی کے مسلح فوجی تھے۔ انہوں نے مجھے دوسری جیپ میں دھکیلا اور میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ جب جیپ اس طیارے کی طرف چل پڑی جو دور دن دے پر کھڑا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے یہاں سے کسی دوسرے شہر انڈین ایئر فورس کے کسی ٹارچہ سنٹر پر لے جایا جا رہا ہے۔ اب میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں فرار ہونے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے موت کا خطرہ ہی کیوں نہ مول لینا پڑے۔ کیونکہ میں ٹارچہ کے سلسلے کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا تھا۔ اگر مجھے مرنا ہی تھا تو میں دشمن کی اذیتیں برداشت کرتے رہنے کی بجائے فرار کی کوشش کرتے ہوئے مرنا چاہتا تھا۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ اگر مجھے ذرا سا بھی موقع مل گیا تو میں فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

کو نہیں بتانا چاہتا کہ انہوں نے مجھ پر تشدد اور ٹارچہ کئے کیسے کیسے حربے استعمال کئے۔ مگر میں نے اپنے آپ کو مضبوط بنائے رکھا۔ ہر تکلیف ہر اذیت برداشت کرتا رہا۔ اگر درد کی شدت حد سے گزر جاتی تو بے ہوش ہو جاتا۔ مجھے فوراً کوئی تیز دوائی سنگھار ہوش میں لایا جاتا اور ہر بار مجھ سے میرے کمانڈو ساتھیوں کے نام پوچھے جاتے۔ میں ہر بار شدید تکلیف کے عالم میں یہی کہتا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ جب ان لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر مجھے مزید ٹارچہ کیا گیا تو میں زندہ نہیں رہوں گا تو مجھے واپس کمرے میں لا کر ڈال دیا گیا۔ یہ سلسلہ نہ جانے کتنی دیر تک کتنے دنوں تک جاری رہا۔ میں بھول گیا کہ مجھے کتنی بار قید خانے سے نکال کر ٹارچہ چیمبر میں لے جایا گیا ہے۔ ہر بار مجھے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ اور جب میں موت کے قریب پہنچ جاتا تو مجھے لا کر قید خانے کے کمرے میں پھینک دیا جاتا۔ وہاں دو تین دن تک مجھے کچھ نہ کہا جاتا۔ مجھے اچھا کھانا دیا جاتا۔ مجھے انجکشن لگائے جاتے۔ جب میرا جسم ذرا طاقت پکڑتا تو ٹارچہ کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا۔

ایک بار مجھے ٹارچہ چیمبر سے لا کر قید خانے کے کمرے میں ڈالا گیا تو میری حالت بہت خراب تھی۔ جسم میں جیسے بالکل جان نہیں رہی تھی۔ زخم کوئی نہیں تھا مگر سارا بدن پھوڑے کی طرح درد کر رہا تھا۔ اب مجھے یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ مجھے کس قسم کا ٹارچہ کیا جا رہا ہے۔ میں نے بے بسی کے عالم میں گویا اپنا جسم ان درندہ صفت بھارتی فوجیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ جو اس پر اذیت رسانی کے ہر قسم کے تجربات کر رہے تھے۔ ایک وقت ایسا آگیا کہ مجھ پر کسی اذیت کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس دوران میں نے اپنی زبان بند رکھی اور وہ لوگ مجھ سے ذرا سا راز بھی حاصل نہ کر سکے۔ جب ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میں مہاووں گا مگر انہیں کچھ نہیں بتاؤں گا تو ایک روز دن کے وقت مجھے کمرے سے باہر نکال کر ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ میرے دونوں ہاتھوں کو ہتھکڑی لگادی گئی تھی۔ نقاہت سے میرا سراپنی جگہ پر قائم نہیں رہتا تھا۔ ادھر ادھر ڈولنے لگتا تھا۔ پھر بھی میں نے اپنی قوت ارادی سے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔ شاید یہ مجھے کسی دوسرے ٹارچہ

والے ہیں۔ جیسے ہی فوجی مجھے دروازے کے پاس لائے وہاں جو ایئر فورس کا آدمی سڑا تھا اس نے ہک نیچے کر کے دروازہ اوپر کو اٹھادیا۔ ہوا کا زبردست تھپیڑا مجھے لگا اور میں وہیں فرش پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دونوں فوجیوں نے فوراً مجھے پیچھے سے دھکیلا اور میں طیارے کے دروازے سے باہر گر گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ گرنے سے پہلے اس طرح پھیلا دیئے تھے۔ جیسے ڈوبنے سے پہلے آدمی تنکے کو بھی پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا ہاتھ بائیں جانب دروازے کے ساتھ جو سیٹ تھی اس پر پڑ گیا۔ اس سیٹ کے پیچھے چڑے کی بیلٹ لٹک رہی تھی۔ اوپر سے فوجیوں نے میرے بازو پر زور سے ٹھڈے مارے تو سیٹ پر سے میرا ہاتھ چھوٹ کر چڑے کی بیلٹ پر آیا تو میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اب میں طیارے کے باہر چڑے کی بیلٹ کے ساتھ نیچے لٹکا ہوا تھا۔ ہوا کے شدید تھپیڑے مجھے ادھر سے ادھر جھلا رہے تھے۔ میں نے بیلٹ کو اب دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ طیارہ چھوٹا تھا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ہوا کے دباؤ سے ڈولنے لگا۔ مجھے اوپر سے کسی کے انگریزی میں چلانے کی آواز آئی۔

”اسے شوٹ کیوں نہیں کرتے“

اس کے ساتھ ہی جہاز نیچے کو غوطہ لگا گیا۔ اس سے جہاز کی بلندی کم ہونا شروع ہو گئی۔ موت سامنے نظر آرہی ہو تو آدمی کے جسم کی چھپی ہوئی طاقتیں بھی بیدار ہو جاتی ہیں۔ میرے جسم میں بھی خدا جانے کہاں سے طاقت آگئی تھی۔ میں نے چڑے کی بیلٹ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور ہوا کے تھپیڑے مجھے جھولا جھلا رہے تھے۔ اچانک اوپر سے فائر ہوا۔ گولی میرے سر کے قریب سے ہو کر نکل گئی۔ میں نے نیچے دیکھا۔ طیارے کی بلندی اس کے ڈولنے کی وجہ سے کم ہو گئی تھی۔ میرے نیچے پہاڑیاں اور جنگلوں کے درخت نظر آرہے تھے۔ اوپر سے ایک اور گولی چلی یہ گولی بھی میرے ادھر ادھر ڈولنے کی وجہ سے نشانے پر نہ لگی۔ اوپر سے شین گن کا برسٹ فائر ہوا تو میں نے بیلٹ کو ہاتھوں سے چھوڑ دیا۔ بیلٹ کو چھوڑتے ہی میں فضا میں قلابازیاں کھاتا نیچے گرنے لگا۔ ہوا میرے جسم کو میرے کانوں اور چہرے کو جیسے چھیلی ہوئی نیچے سے اوپر کو جارہی تھی۔ میں نے فوراً

میں نے ایک فوجی سے پوچھا۔
”یہ کونسا شہر ہے“
اس نے مجھے گالی دے کر کہا۔

”اب پوچھ کر کیا کر لے گا کہ یہ کونسا شہر ہے خاموش بیٹھارہ۔“

میں نے اس کے فقرے کی حقیقت کو اس وقت سمجھنے کی بالکل کوشش نہ کی۔ یہ حقیقت مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ جیپ فوجی طیارے کے پاس جا کر رک گئی۔ کھلی جیپ تھی طیارہ دن کی روشنی اور دھوپ میں صاف نظر آرہا تھا۔ یہ ایک نچلے والا ایئر فورس کا چھوٹا طیارہ تھا۔ جس کی تین کھڑکیاں تھیں۔ سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ مجھے آرمی کے تینوں فوجیوں نے پکڑ کر چلاتے ہوئے طیارے کے اندر لا کر ایک سیٹ پر بٹھادیا۔ وہاں پہلے سے ایئر فورس کی وردی میں لبوس دو آدمی کھڑے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا تو مجھے ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دکھائی دیئے۔ جیسے کہہ رہے ہوں اس کے بعد نہ تم ہمیں دیکھ سکو گے نہ ہم تمہیں دیکھ سکیں گے۔ میں نے ان تاثرات کو جذبہ ترحم سمجھا اور سر جھکا کر طیارے کی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ سیڑھی ہٹا دی گئی۔ طیارے کا انجن شارت ہوا۔ طیارہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ پھر دن وے پر اپنے خاص مقام پر آکر طیارے کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس کے بعد وہ فضا میں بلند ہو گیا۔ طیارے نے ایک چھوٹا سا چکر کاٹا اور پھر آہستہ آہستہ بلندی پر جا کر ایک طرف پرواز کرنے لگا۔ مجھے ایسی جگہ پر بٹھایا گیا تھا جہاں سے میں باہر اور نیچے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ طیارے کو سیدھا پرواز کرتے دس پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ آرمی کے دو فوجی میرے دائیں بائیں بیٹھے تھے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میری ہتھکڑی طیارے میں سوار کراتے وقت کھول دی گئی تھی۔ میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ وہ اچانک کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی بازو سے پکڑ کر اٹھالیا۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے جہاز کے دروازے کے پاس لے آئے جہاں سیڑھی لگا کر مجھے جہاز میں سوار کیا گیا تھا۔ وہاں طیارے کے عملے کا ایک آدمی پہلے سے جیسے تیار کھڑا تھا۔ دہشت اور خوف سے میرا جسم ایک دم سرد پڑ گیا۔ میری چھٹی حس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرنے

نہ تھی جس کے اندر میں آدھے سے زیادہ دھنس گیا تھا۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں بہت اچھا تیراک بھی تھا اور مجھے پانی کے اندر سانس روک کر زیادہ سے زیادہ دیر تک چھپے رہنے کی باقاعدہ ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اوپر اٹھانا شروع کر دیا۔ اس وقت میرا جسم ذرا بھی درد نہیں کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں پانی کی سطح سے باہر نکل آیا۔ اور تیرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک بہت بڑی جھیل تھی۔ تالاب نہیں تھا۔ اگر میں کسی تالاب میں گرتا تو زندہ نہ بچتا۔ کیونکہ تالاب کتنا بڑا کیوں نہ ہو جھیل جتنا گہرا نہیں ہوتا اور ہندوستان کے وسطی جنگلوں میں گہری اور کشادہ جھیلیں عام پائی جاتی ہیں۔ براہ کے جنگلوں میں تو بعض جھیلیں سمندر کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ جھیل بھی چھوٹا سا سمندر ہی ہوتا ہے۔ اس کا پانی کبھی خشک نہیں ہوتا۔ آس پاس کی پہاڑیوں کے علاوہ جھیلوں کی تہ سے بھی پانی نکل نکل کر جمع ہوتا رہتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جھیل بھی سمندر ہی ہوتا ہے جو خشکی کے بیچ میں آگیا ہوتا ہے۔ تیرتا تیرتا میں کنارے کے سرکنڈوں میں سے نکل کر کنارے پر آکر بیٹھ گیا۔ اب مجھے شدید کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ میں وہیں کنارے پر لیٹ گیا۔ میرے اوپر گھنے درختوں کا سایہ تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں دیر تک لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ جب مجھے ذرا سکون نصیب ہوا تو میں نے لیٹے لیٹے اپنے جسم کو ہاتھ لگا کر ٹانگوں، گھٹنوں کا جائزہ لیا۔ میری ہڈیاں سلامت تھیں۔ جسم کے کسی حصے میں درد بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ صرف طیارے سے گرنے کا خوف تھا جس کا جسم پر ابھی تک اثر تھا اور اگر میں مضبوط اور کسرتی اور تربیت یافتہ جسم کا مالک نہ ہوتا تو شاید اتنی جلدی میرے بدن کی توانائی واپس نہ آتی۔ میں دوبارہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے جوتے اتار دیئے۔ میری جیکٹ ٹارچر چیمبر میں ہی اتار لی گئی تھی۔ میں نے پتلون کو اتار کر تھوڑا سا نچوڑا اور اسے پھر پین کر اسی جگہ بیٹھا۔ سامنے اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

اپنی دونوں ٹانگیں اور بازو کھول کر پھیلا دیئے۔ اس سے اتنا ہوا کہ میں پتھر کی طرح نیچے گرنے کی بجائے ہوا میں گلائید کرنے لگا۔ لیکن زمین تیزی سے اوپر آرہی تھی۔ درخت مجھے چکنا چور کرنے کے لئے میری طرف بڑی تیزی سے اوپر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک ایک طرف سے تیز ہوا کا زبردست تھپڑا مجھے لگا اور میں بائیں جانب کو سوکھی شاخ کی طرح فضا میں اڑتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس کے بعد پھر نیچے گرنے لگا۔ میں نے دل میں کلمہ پڑھا خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور اپنی جان اس کے سپرد کرنے کو تیار ہو گیا۔ میری موت یقینی تھی۔ ایک سیکنڈ کے لاکھوں حصے کے اندر اندر میری ساری زندگی کی فلم میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی۔ مجھے اپنی چھوٹی شہید بہن کلثوم کا خیال آیا جس کو پاکستان بننے وقت سکھوں نے شہید کر دیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک زبردست دھماکہ مجھے سنائی دیا میرے جسم کو زبردست دھچکا لگا اور میں نیچے ہی نیچے اترتا چلا گیا۔ آہ! موت کتنی آسان تھی۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ صرف ایک دھچکا لگا تھا اور میں موت کی گودی میں اترتا جا رہا تھا۔ اچانک میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ مرنے کے بعد میرا دم کیوں گھٹ رہا ہے۔ کیا میں ابھی تک مرا نہیں؟ تب مجھے اپنے ارد گرد پانی کا دباؤ محسوس ہوا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اور دھچکا لگا اور میرا جسم گرتے گرتے کسی جگہ لگ کر رک گیا۔

اب مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میں مرا نہیں زندہ ہوں۔ اور طیارے سے گرائے جانے اور چڑے کی بیلٹ کو چھوڑنے کے بعد میں کسی درخت یا پہاڑی چٹان پر نہیں گرا بلکہ کسی تالاب یا جھیل یا دریا میں گرا ہوں۔ فوجی طیارے سے گرتے وقت میرا سیٹ بیلٹ کو پکڑ کر کچھ دیر تک ہوا میں لٹکتے رہتا اور پھر بیلٹ کو چھوڑ دینے کے بعد ہوا کے تیز تھپڑے کا مجھے اٹھا کر کچھ دور آگے لے جاتا میرے لئے نئی زندگی کا پیغام ثابت ہوا اور یوں میں عین گہرے پانی کے اوپر آکر گرا۔ ورنہ اگر میں وہاں گرتا جہاں بھارتی فوجیوں نے مجھے طیارے سے دھکا دے کر گرایا تھا تو اس وقت تک میں زندہ نہ ہوتا۔ میں نے تیزی سے اپنے آپ کو پانی کی تہ کے کیچڑ سے اوپر کو اٹھایا۔ پانی کی تہ میں کیچڑ کی موٹی

تھا اسی طرف چل رہا تھا۔ میں جنگل میں درختوں کے درمیان تھوڑی دور تک چلا ہوں گا کہ مجھے پتوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی نے بڑے رعب سے دیہاتی زبان میں پوچھا۔

”کونو ہو۔ تماڑے رہو۔“

میں وہیں رک گیا۔ وسطی ہند کے جنگل اور یہاں کے جنگلی اور دیہاتی لوگ میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ ان جنگلوں کی میں نے اپنی کمانڈو ٹریننگ کے دوران اور اس کے بعد بھی کمانڈو کارروائیوں کے سلسلے میں بھی کافی خاک چھانی تھی۔ میں نے بولنے والے کی آواز اور اس کے رعب دار لہجے سے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی سیدھا سادا دیہاتی نہیں ہے۔ کوئی اور ہی معاملہ ہے۔

اتنے میں تین آدمی درختوں کے پیچھے سے نکل کر میرے سامنے آگئے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے پوچھتے کہ میں کون ہوں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں۔ چنانچہ میں کھڑے کھڑے لاشی کے سارے کانپے لگا۔ ساتھ ساتھ کراہتا بھی جا رہا تھا۔ پھر میں نے دہائی دیتے ہوئے کہا۔

”بھائی مجھے بچالو۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔“

اور اس کے ساتھ ہی میں اداکاری کرتے ہوئے گر پڑا اور ظاہر کیا کہ میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔ میں نے ان تینوں آدمیوں کے کاندھوں پر لگی ہوئی رائفلیں دیکھ لی تھیں۔ ان کے تنک پاجامے اور کمر تک آئے ہوئے گھیردار کرتے تھے۔ سروں پر گزریاں تھیں جن کے شملے اوپر اٹھا کر انہوں نے ٹھوڑیوں سے اوپر سروں پر باندھے ہوئے تھے۔ یہ حللیے بھوپت ڈاکو کے ساتھیوں سے ملتے جلتے تھے۔ وہ میرے قریب ہو کر بیٹھ گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ان کی ساری باتیں میں اس علاقے کی خفیہ دیہاتی ہندی زبان میں نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ اب وہ زبان مجھے اتنی روانی سے یاد نہیں رہی۔ جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ مجھے یاد ہے۔ چنانچہ میں ان کے الفاظ اپنی زبان میں لکھوں گا۔ ایک نے کہا۔

”ارے لکھو! یہ کسی ٹھاکر کا بیٹا لگتا ہے جس کے پیچھے اس کے دشمن لگے ہیں“

یہ جھیل جس کے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وسطی ہندوستان کے کسی پہاڑی سلسلے میں واقع تھی۔ میرے سامنے اور دائیں بائیں دور مجھے اونچی نیچی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ جھیل کے کنارے کنارے اونچی چھتریوں والے درخت تاحہ نظر تک چلے گئے تھے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر بھی پہاڑ کھڑے تھے۔ ہوا جیسے بند تھی۔ فضا میں جس سا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی درخت پر کوئی پرندہ بول کر چپ ہو جاتا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ بھارتی فوجی میری تلاش میں وہاں آجائیں گے۔ کیونکہ وہ اپنی طرف سے مجھے طیارے سے نیچے پھینک کر ہلاک کر چکے تھے۔ وہ لوگ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں اتنی بلندی سے نیچے پہاڑیوں میں گرنے کے بعد زندہ بچ گیا ہوں گا۔ میں نے سوچ اٹھ کر چلا جائے اور معلوم کرنا چاہئے کہ میں کہاں ہوں۔ یہ جنگل کہاں تک چلا گیا ہے اور اس جنگل کے قریب ہندوستان کا کونسا شہر ہے۔ میرے پاس سوائے میرے چڑے کے جوتوں، پتلون اور قمیض کے اور کچھ نہیں تھا۔ اونچے اونچے درختوں کی شاخوں میں سے پھیکی پھیکی دھوپ نیچے آرہی تھی۔ یہاں درخت اتنے گنجان نہیں تھے۔

جب میں چلنے لگا تو مجھے میری بائیں ٹانگ میں درد محسوس ہوا۔ پھر بھی میں چلتا رہا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد درد میں اضافہ ہو گیا۔ ٹانگ پر زور دیتا تو درد کی ٹیس اٹھتی۔ میں نے زمین پر سے ایک درخت کی موٹی ٹہنی اٹھا کر اس کے پتے صاف کئے اور اس کے سارے چلنے لگا۔ اس طرح چلنے سے مجھے کچھ آرام مل گیا۔ میں نے جس طرف منہ اٹھایا

دوسرے نے کہا۔

”تم کیسے کہہ رہے ہو؟“

پہلے نے کہا۔

”تو پھر کسی کو اسے مارنے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ ارے لکھو لڑکا جوان ہے خوش شکل ہے۔ ضرور اس کو جائیداد کی خاطر دولت کی خاطر اس کے تائے چاچا مارنا چاہتے ہوں گے“

تیسرا بولا۔

”تو پھر ہمیں اس بک بک سے کیا لیتا ہے بھیا! اس کو یہاں ہی چھوڑو اور ڈیرے پر چلو۔ کہیں اس کے پیچھے پولیس ہی نہ لگی ہو۔ خواخواہ ہم بھی پھنس جائیں گے۔“

میں سب کچھ سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں۔ اتنا میں ضرور چاہتا تھا کہ اس قسم کے جرائم پیشہ لوگ اگر کسی کے دوست بن جائیں تو پھر بڑے رخا دار اور جانثار دوست ثابت ہوتے ہیں۔ میری جسمانی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں ایک ایسے جنگل میں غیر معلوم مدت تک چلتا چلا جاؤں۔ مجھے آرام اور تھوڑی بہت خوراک کی بھی ضرورت تھی تاکہ اپنی طاقت بحال کرنے کے بعد واپس اپنے کمانڈو مجاہد ساتھیوں کے پاس کشمیر جاؤں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب تک ان لوگوں کو مجھ سے کوئی لالچ نہیں ہوگا۔ یہ کبھی اٹھا کر مجھے اپنے ڈیرے پر نہیں لے جائیں گے اور ان کے ڈیرے پر جا کر ہی مجھے خوراک کے علاوہ کچھ دیر کے لئے آرام مل سکتا تھا۔ میں اگر ان سے کسی طرح پیچھا چمڑا کر کسی قریبی قصبے یا شہر کی طرف بھی نکل جاتا تو وہاں اول تو مجھے کوئی کچھ دنوں کے لئے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے مشکوک سمجھ کر کوئی شخص پولیس کو مخبری بھی کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے ذہن میں پوری سکیم تیار کر کے کراہنا شروع کیا۔ جیسے ہوش میں آرہا ہوں۔ میں بڑبڑانے لگا۔

”بگو چاچا مجھے نہ مارو۔ میں تمہارا بھتیجا ہوں۔ ہائے مجھے نہ مارو۔ میری ساری

دولت لے لو۔ مجھے نہ مارو۔“

میں نے تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھول رکھی تھیں۔ دولت کا سن کر میں نے دیکھا کہ تینوں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک نے جس کا نام لکھو لیا گیا تھا مجھ سے کہا۔

”ہوش کرو بھیا! تمہیں کوئی نہیں مارے گا۔ ہم تمہارے پاس موجود ہیں۔ نہیں بتاؤ بات کیا ہوئی تھی۔“

میں نے آنکھیں کھول دیں اور کراہتے ہوئے کہا۔

”مجھے اٹھا کر بٹھا دو“

انہوں نے مجھے اٹھا کر بٹھا دیا۔ وہ خود بھی چو کڑیاں مار کر میرے ارد گرد بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔

”بھائی۔ میرا نام دھرم دیر ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر جو بڑا قصبہ ہے۔ وہ وہ“

اب مجھے کیا معلوم تھا کہ وہاں سے قریب بڑا قصبہ کونسا ہے۔ اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہاں قریب یا دور کوئی نہ کوئی بڑا قصبہ ضرور ہوگا۔ میں نے اپنے اوپر نقاہت طاری کر لی۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

”بولو بولو۔ کونسا قصبہ؟ کیا تم امرالی قصبے کی بات کر رہے ہو؟“

”ہاں۔ ہاں۔ امرالی میں امرالی کے ٹھاکر دیوان دیر سنگھ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میرے ماما پتا سورگباش ہو گئے ہیں۔ پتاجی کی میں ساری جائیداد کا اکلوتا مالک ہوں۔ اس کے علاوہ میرے پتاجی نے سونے چاندی کی دو سو ڈیلیاں اور کچھ ہیرے جواہرات ایک ہانڈی میں بند کر کے حویلی کے اندر میرے سامنے ایک خفیہ جگہ پر زمین میں دبا دیئے تھے اور کہا تھا جب تم کو زندگی میں کبھی کاروبار میں گھانا پڑ جائے اور دولت کی ضرورت پڑے تو یہ ہانڈی یہاں سے نکال کر اس کی دولت سے کوئی نیا کاروبار شروع کر دینا۔ میرے چاچا لہ جگت سنگھ کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ حویلی میں کسی جگہ سونے کی ڈیلیوں اور جواہرات والی ہانڈی میرے پتاجی نے دفن کر رکھی ہے اور اس کا راز صرف مجھے ہی مسوم ہے۔ اس نے مجھ سے پہلے تو محبت پیار سے یہ راز حاصل کرنے کی کوشش کی جب میں نے بتانے

دوسرے آدمی کا نام رامو تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

”نہیں نہیں۔ بھیا اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چل سکتا ہوں۔“

رامو نے مجھے بازو سے تھام لیا اور میں لاشی کے سہارے ان کے ساتھ جنگل میں چل پڑا پہلے تو درخت دور دور تھے۔ پھر قریب قریب آتے گئے۔ اور جنگل بہت گھنا ہو گیا۔ راستے میں ایک چھوٹی سی ندی بھی آئی۔ وہ آپس میں اشاروں کنایوں میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ ان میں سے دو سگریٹ پی رہے تھے۔ ایک بیڑی پی رہا تھا۔ لگتا تھا کہ میری موجودگی میں وہ کسی موضوع پر کھل کر بات نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن میں کوئی انڈی نہیں تھا۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کسی جگہ ڈاکہ ڈالنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ندی پار کر کے چند قدم چلے تو ایک طرف چھوٹا سا ٹیلہ نظر آیا۔ ٹیلے کے پاس درختوں کے نیچے چھ سات گھوڑے کھڑے تھے۔ ایک آدمی ان کے آگے چارہ وغیرہ رکھ رہا تھا۔ اس آدمی نے میری طرف غور سے دیکھا۔ لکھو بولا۔

”ارے گھور کے کیا دیکھتا ہے یہ اپنے ٹھاکر صاحب ہیں۔ ہاں۔ چل جلدی سے چل کر چائے پانی کا بندوبست کر۔“

ٹیلے کے اوپر ایک جگہ ان لوگوں نے اپنا ڈیرہ بنایا ہوا تھا۔ تھوڑی سی کھلی جگہ تھی۔ دو چولہوں میں آگ جل رہی تھی۔ ایک چولے پر ایک آدمی روٹیاں پکا رہا تھا۔ دوسرے چولے پر بڑا سا پتیلا دھرا تھا۔ جس میں کچھ پک رہا تھا۔ ایک آدمی اس کے پاس بیٹھا پیاز کاٹ رہا تھا۔ ان آدمیوں نے بھی میری طرف غور سے دیکھا۔ لکھو اور رامو نے انہیں بھی یہی کہا کہ یہ اپنے بابو صاحب ہیں۔ ٹھاکر دیوان ویر کے پتر ہیں۔ ہمارے ہاں کچھ روز مسمان رہیں گے۔ ٹیلے کی دیوار میں ایک غار کا منہ نظر آرہا تھا اس کے آگے سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ پاس ہی درختوں کی شاخوں کو کاٹ کر بنائی گئی جھونپڑی تھی۔ جھونپڑی کے باہر بانس کی چارپائی بچھی تھی۔ مجھے چارپائی پر بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے لئے چائے کا گلاس آگیا۔ میں خاموشی سے چائے پینے لگا۔ چائے نے میرے جسم میں ایک جستی سی پیدا کر دی۔ ٹانگ میں تھوڑا تھوڑا درد ضرور ہو رہا تھا۔ رامو بولا۔

سے صاف انکار کر دیا تو کل رات کو وہ مجھے اپنے غنڈوں کی مدد سے باندھ کر جنگل میں لے آیا۔ اور مجھے اس قدر مارا کہ میں نیم بے ہوش ہو گیا اس کے بعد ان غنڈوں نے مجھے جھیل میں پھینک دیا اور چلے گئے۔ میری قسمت اچھی تھی کہ جھیل میں گرتے ہی مجھے ہوش آگیا۔ میں کسی نہ کسی طرح جھیل سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر مار کھانے کی وجہ سے میرا سارا بدن دکھ رہا تھا۔ میں باہر نکلتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ دن کے وقت ہوش آیا۔ اب وہاں سے درخت کی شاخ پکڑ کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا کہ کسی طرح تھانے پہنچ کر بچا کے خلاف رپورٹ درج کراؤں۔“

تینوں جرائم پیشہ آدمیوں کی جو یقیناً چھوٹے موٹے چور ڈاکو لگ رہے تھے۔ میری کہانی سن کر باچھیں کھل گئیں۔ میری سکیم کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ کہنے لگے۔

”ارے بھیا جی! تمہیں پولیس کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ پولیس تو تمہارا سارا مال ہڑپ کر جائے گی اور تمہارے بچا کو بھی نہیں پکڑے گی۔ ہم تمہیں تمہارا مال دلوائیں گے۔ ہم تمہارے ظالم بچا سے تمہارا بدلہ لیں گے۔“

لکھو بولا۔

”ارے ٹھاکر! ہم تمہارے بچا کو یہاں بلا کر اس کی مرمت کریں گے۔ اس کی کیا مجال ہے کہ تمہاری دولت تم سے چھین سکے۔“

دوسرا کہنے لگا۔

”ارے ہم تمہارے ظالم بچا کو ختم ہی کر دیں گے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے کی بانسری۔ پھر تم ساری دولت کے مالک ہو گے۔ بے شک اپنی مرضی کا کاروبار کرنا۔ کوئی زمینداری خرید لیتا۔ چلو ہمارے ساتھ ڈیرے پر چلو۔ ہم تمہارے دوا دارو کا بندوبست کرتے ہیں۔ بس اب تم بے فکر ہو جاؤ۔“

تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ انہوں نے مجھے اس قدر احتیاط کے ساتھ زمین پر سے سہارا دے کر اٹھایا جیسے میں کوئی انتہائی نازک اور قیمتی چیز ہوں۔ لکھو بولا۔

”ارے بابو صاحب کو کاندھے پر بٹھا لو رامو“

”ارے بابو جی! تمہارے کپڑے گیلیے ہو رہے ہیں۔ یہ اتار کر دوسرے پن لو۔ ہم اسے سکھائی دیتے ہیں۔“

ایک آدمی میرے لئے دھوتی کرتا لے آیا۔ میں نے پتلون قبض اتار کر دھوتی کر دی پن لیا۔ لکھو نے اپنے ایک آدمی سے کہا۔

”چل بے۔ ندی پر جا کر ان کو دھو کر لے آ اور سکھانے کے لئے ڈال دے۔“

میرے بدن پر ٹارچر سیل میں مجھ پر کئے گئے تشدد کے نشان سوائے میرے پیٹ پر کی گئی نشتر زنی کے زخم کے اور کہیں بھی کوئی نشان نہیں تھا۔ لیکن ایک آنکھ ایک طرف سے سوچی ہوئی تھی۔ چوٹیں زیادہ تر جسم کے اندر لگی تھیں۔ پیارے سے گرنے کی وجہ سے بائیں ٹانگ میں بھی درد کی ٹیسس پڑ رہی تھیں۔ لکھو کوئی خاص قسم کا تیل لے آیا۔ کہنے لگا۔

”اس کی مالش سے درد ختم ہو جائے گا۔ وہ میری ٹانگ اور جسم کے دوسرے حصوں پر تیل کی مالش کرنے لگا۔ اس آؤ بھگت کی وجہ ہیرے جواہرات اور سونے کی ڈیلوں والی وہ فرضی ہانڈی تھی جو امرالی قصبے کی میری آبائی حویلی میں کسی جگہ دفن تھی اور جس کا سوائے میرے اور کسی کو علم نہیں تھا۔ یہ لوگ مجھ سے وہ جگہ معلوم کرنا چاہتے تھے جہاں وہ خزانہ دفن تھا۔“

لکھو میری ٹانگ پر مالش کرتے ہوئے بولا۔

”ٹھاکر بابو! امرالی کا قصبہ تو یہاں سے بہت دور گوالیار کے پاس ہے۔ تمہارا چچا تمہیں قتل کرنے کے لئے اتنی دور کیوں لے آیا تھا۔ کیا راستے میں کوئی جگہ نہیں ملی تھی؟“

پہلی بار مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں ہندوستان کی وسطی ریاست گوالیار کے آس پاس ہوں۔ یقیناً جس ٹارچر سیل میں مجھے اذیت کا نشانہ بنایا گیا وہ گوالیار کی فوجی چھاؤنی میں ہی تھی۔ میں نے کہا۔

”چچا بگو چاہتا ہو گا کہ کسی دور دراز علاقے میں لے جا کر مجھے ٹھکانے لگائے تاکہ

پولیس کو اس پر شک نہ پڑے۔“

تین دن گزر گئے۔ ان ڈاکوؤں نے میری خوب خبر گیری کی۔ اچھا کھلاتے پلاتے۔ دوا دارو بھی کرتے رہے۔ ایک ڈاکو کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ روزانہ صبح شام میری ٹانگ کی مالش کرے۔ میری آنکھ کی سوجن بہت کم ہو گئی تھی۔ مگر بائیں ٹانگ پر ابھی میں دباؤ ڈالتا تو درد اٹھتا تھا۔ میں یہاں کچھ روز مزید قیام کر کے مکمل صحت یاب ہو کر کشمیر جانا چاہتا تھا۔ جب تک میں صبح طور پر چل نہیں سکتا تھا میں واپس نہیں جاسکتا تھا۔ اس دوران لکھو ایک رات میرے پاس آیا اور چارپائی پر بیٹھ کر بیڑی پینے لگا۔ وہ مجھ سے بڑی پیار محبت کی باتیں کرنے لگا۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد بولا۔

”ٹھاکر بابو! تم اپنے خاندان کی ایک ہی اولاد ہو۔ تمہارے پتاجی نے جو تمہارے لئے دولت چھپا کر زمین میں دبائی ہوئی ہے اس پر تمہارا ہی حق ہے۔ تمہارے بدمعاش چچا کا حق نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ دولت صرف تم ہی کو ملے۔ لیکن ہماری مدد کے بغیر تم اپنی دولت حاصل نہیں کر سکتے۔ تمہارا چچا تمہیں ایسا نہیں کرنے دے گا۔ تم واپس جاؤ گے تو وہ تمہیں ایک بار پھر اپنے غنڈوں کی مدد سے قتل کروانے کی کوشش کرے گا۔“

میں نے پریشان ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

”لکھو کا کا۔ پھر تم جس طرح کہتے ہو میں اسی طرح کروں گا۔“

لکھو کا چہرہ کھل گیا۔ بیڑی ایک طرف پھینک کر بولا۔

”ایسا کرتے ہیں کہ تم ہمیں بتادو کہ حویلی میں تمہارے پتاجی نے ہیرے جواہرات والی ہنڈیا کس جگہ دبائی ہے۔ ہم اسے نکال کر یہاں لے آئیں گے اور تمہارے حوالے کر دیں گے۔“

یہ ڈاکو خوب ترکیب بتا رہا تھا۔ مگر مجھے ابھی ان لوگوں کے ذریعے پر کچھ دن رہ کر اپنی صحت کو بحال کرنا تھا۔ میں نے کہا۔

”لکھو کا کا! آج چاند کی کتنی تاریخ ہے؟“

میرے ذہن میں ایک ترکیب آگئی تھی۔ وہ بولا۔

”پہلی یا دوسری ہوگی۔ کیوں تم کس لئے پوچھ رہے ہو؟“

میں نے کہا۔

”میرے پتائی نے سورگباش ہوتے ہوئے کہا تھا کہ ہانڈی کو چاند کی اکیس تاریخ کو زمین سے نکالنا اگر پہلے نکالو گے تو ہانڈی تمہیں خالی ملے گی۔ اس میں دولت نہیں ہوگی۔“

یہ لوگ اس قسم کی باتوں پر بہت اعتقاد رکھتے ہیں یہ مجھے معلوم تھا لکھو بولا۔

”تب تو ہمیں بیس ایک روز کے لئے ٹھہرنا ہوگا۔“

پھر خود ہی ہنس کر کہنے لگا۔

”ارے بابو کوئی بات نہیں۔ تم بھی ہمارے پاس ہو۔ ہم بھی یہیں ہیں۔ بیس روز

بعد چل کر ہنڈیا نکال لیں گے۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ حالانکہ مجھے اتنے دن وہاں ٹھہرنا نہیں تھا۔ میری ٹانگ

کا درد زیادہ سے زیادہ تین چار دنوں میں ٹھیک ہو جانے والا تھا۔ اس کے فوراً بعد مجھے

وہاں سے چپکے سے روپوش ہو جانا تھا۔ ان لوگوں نے ایک گائے بھی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے

روزانہ اس کا دودھ پلاتے۔ مکھن بھی کھلاتے۔ میں کچھ ہی دنوں میں پوری طرح صحت

مند ہو گیا۔ ایک ہفتے بعد ٹانگ کا درد بھی جاتا رہا۔ اب میں وہاں سے کشمیر کی طرف نکل

جائے۔ کارپروگرام بنانے لگا۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ کشمیر تک جانے کے

لئے مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔ یہ بھی خیال تھا کہ کسی طرح ایک ریوالور ہی مل

جائے۔ ان ڈاکوؤں کے پاس رائفلیں اور پرانے فیشن کی دو تالی بندوقیں تو تھیں مگر پستول

وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ پستول کی بھی ضرورت نہیں میں کسی بہانے لکھو کا

سے کچھ روپے بطور قرض لے لیتا ہوں۔ مصیبت یہ تھی کہ اب کبمل مجھے نہیں چھوڑ رہا

تھا۔ میں ان کی مرضی کے بغیر وہاں سے پاؤں باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہو گیا تھا

کہ میری خفیہ طور پر نگرانی کی جا رہی ہے۔ میں اگر ندی پر منہ ہاتھ دھونے کے لئے جاتا

تو دو رائفل بردار ڈاکو میرے ساتھ ہوتے تھے۔ لکھو نے یہ بہانہ بنایا تھا کہ میری حفاظت

اس لئے کی جا رہی ہے کہ کہیں میرے چچا کے غنڈے یہاں آکر مجھے قتل نہ کر دیں۔

اس اثناء میں ایسا ہوا کہ رات کو باہر کچھ شور سا ہوا۔ میں جھونپڑی میں لیٹا فرار کے

نصوبے بنا رہا تھا۔ پہلے دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ پھر آدمیوں کی باتیں

رہنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے اٹھ کر جھونپڑی کے باہر سر نکال

کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر لیپ روشن تھا۔ اس کی روشنی میں میں نے لکھو وغیرہ کو دیکھا۔

کچھ اجنبی لوگ اپنے گھوڑوں کے پاس کھڑے لکھو اور رامو سے باتیں کر رہے تھے۔ لکھو

کہہ رہا تھا۔

”دادا سکھ دیال تم نے بڑا زبردست کام کیا ہے۔ ہم کچھ نہیں تو ایک لاکھ روپیہ لے

لڑکی کو چھوڑیں گے۔ ارے ہمارے پاس تو سونے کی چڑیا آکر پھنس گئی ہے۔“

اس کے پاس جو آدمی کھڑے تھے ان میں سے ایک نے کہا۔

”بس اب تم اسے حفاظت سے اپنے پاس رکھو۔ ہم اس کے گھر والوں سے بات

لرتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس کے ساتھی بھی گھوڑوں پر بیٹھ گئے۔ پھر وہ

رختوں کے اندھیرے میں چل پڑے۔ لکھو نے بلند قہقہہ لگا کر رامو سے کہا۔

”ارے رامو! ہماری تو قسمت پھر جائے گی۔ لڑکی راجے ہمارا جوں کے خاندان سے

اب کماری ہے راجکماری۔ بس چوبیس گھنٹے اس کی پہرے داری کرنا۔“

رامو بولا۔

”دادا تم بے فکر رہو۔ سمجھو میں نے لڑکی کو صندوق میں بند کر کے چابی اپنی جیب

میں رکھ لی ہے۔“

سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے۔ ان لوگوں کے

سرے ساتھی کسی امیر کبیر گھرانے کی عورت کو اغوا کر کے لے آئے تھے۔ اب اسے

غلام بنا کر اس کے ماں باپ سے سودا کرنے والے تھے۔ اس قسم کی وارداتیں ایسے

لے اکثر کرتے رہتے ہیں۔ میں نے اس میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی اور چارپائی پر لیٹ کر

رنگ کے دہانے پر ایک ڈاکو را نقل لئے بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ لکھو بولا۔
 ”لڑکی اندر بیٹھی ہے۔ تم جا کر اسے سمجھاؤ۔ ہمیں اس سے ایک ضرور لکھوانا
 ہے۔ ہماری بات وہ نہیں مانے گی۔ تم اسے سمجھاؤ کہ ایک لاکھ روپے لئے بغیر ہم لوگ
 یہاں سے کبھی نہیں جانے دیں گے۔“

میں سرنگ کے اندر چلا گیا۔

سرنگ زیادہ لمبی نہیں تھی۔ پانچ چھ قدموں کے بعد میں نے ایک لڑکی کو دیکھا زمین
 برف بچھی تھی۔ لڑکی زانوؤں پر سر رکھے گم سم سی صف پر بیٹھی تھی۔ قریب ہی مٹی کا
 باجل رہا تھا۔ ایک تھالی اور پیتل کا گلاس بھی پڑا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر
 لڑکی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یقین کریں میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ زرد رنگ کی اس لڑکی کی
 ہزار ہا سال کی ہوگی۔ بڑی مدت کے بعد میں نے ایک انتہائی خوبصورت لڑکی
 دیکھی تھی۔ اس کے سیاہ بال شانوں سے بھی نیچے تک آئے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں
 بات کی چمک تھی۔ میں پتلون قبض میں تھا اور ڈاکوؤں سے مختلف آدمی لگ رہا تھا۔

میں نے مجھ سے بڑی شائستہ ہندی آمیز اردو زبان میں پوچھا۔

”کیا تم بھی ان ڈاکوؤں کے ساتھی ہو؟ مگر تم مجھے پڑھے لکھے آدمی لگتے ہو۔ پلیز مجھے
 سناؤ کہ تم نے ایک لاکھ روپے نہ دیئے تو یہ لوگ نہ صرف میری
 عزت لوٹ لیں گے بلکہ مجھے قتل بھی کر دیں گے۔ لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ تم بھی پڑھے
 لکھے ہو۔ تم اس سے بات کر سکتے ہو۔ اسے سمجھا سکتے ہو۔ ہم جٹ بوٹ ان پڑھ لوگ
 اس کا تعلق ایسے خاندان سے ہے جہاں عزت و وقار کی خاطر جان قربان کر دینا بڑے فخر کی
 بات سمجھی جاتی ہے۔ میں نے اسی لمحے سوچے سمجھے بغیر یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اس لڑکی کو
 ہاں سے نکال کر اس کے ماں باپ کے گھر پہنچاؤں گا۔ میں اس کی عزت برباد نہیں ہونے
 دے گا۔ یہ میرے دل کا فیصلہ تھا اور دل کے فیصلے بڑے صحیح ہوتے ہیں۔ میرے دماغ نے
 ہنسا شروع کر دیا تھا اور وہ مجھے دوسرے راستے پر ڈالنے لگا تھا کہ میں نے سوچنا بند کر

دیا۔ اپنے دل کے فیصلے پر قائم ہو گیا اور لڑکی کو آہستہ سے کہا۔

فرار کے اپنے منصوبوں پر غور کرنے لگا۔ دوسرے دن لکھو میرے پاس آیا۔ میں دروازہ
 کے نیچے چارپائی پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ آج کسی بہانے لکھو سے میں کچھ روپے بطور قرض
 ضرور لے لوں گا تاکہ آج ہی رات کو میں خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤں۔ لکھو میرے
 پاس آکر بیٹھ گیا اور بڑی رازداری سے بولا۔

”ٹھاکر بابو! تم سے ایک بات کرنی ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ لکھو یہی کہنے آیا ہے کہ میں چاند کی بیس اکیس تاریخ کا انتظار نہیں
 کر سکتا۔ میرے ساتھ آج ہی رات کو حویلی میں چلو اور وہ جگہ دکھاؤ جہاں سونے کی ڈلیوں
 والی ہڈیا دفن ہے۔ ہم اسے نکال کر یہاں لے آئیں گے۔ میں نے کہا۔
 ”کو دادا! کیا بات ہے؟“

اس نے مجھے اس لڑکی کے بارے میں ساری کہانی سنادی جس کو اس کے ساتھی افوا
 کر کے لائے تھے اور جس کا مجھے رات کو علم ہو چکا تھا۔ لکھو ساری کہانی سننے کے بعد
 بولا۔

”ہمارے آدمی لڑکی کے باپ سے بات چیت کرنے والے ہیں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ
 لڑکی کے ہاتھ سے ایک خط لکھوا کر اس کے باپ کو دیا جائے جس میں وہ لکھے کہ میں یہاں
 سخت مشکل میں ہوں۔ اگر تم نے ایک لاکھ روپے نہ دیئے تو یہ لوگ نہ صرف میری
 عزت لوٹ لیں گے بلکہ مجھے قتل بھی کر دیں گے۔ لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ تم بھی پڑھے
 لکھے ہو۔ تم اس سے بات کر سکتے ہو۔ اسے سمجھا سکتے ہو۔ ہم جٹ بوٹ ان پڑھ لوگ
 ہیں۔ تمہاری بات کا اس پر اثر ہوگا۔“

میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ مجھے لڑکی کے پاس لے چلو۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔“

لکھو بولا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“

ٹیلے کی دوسری جانب ایک جگہ چٹانوں میں ایک قدرتی سرنگ بنی ہوئی تھی۔

”میں تمہیں اس نرگ سے نکال کر لے جاؤں گا فکر نہ کرو۔“

لڑکی کے چہرے پر ایک نور سا پھیل گیا۔ اس نے پوچھا۔

”تم ان کے ساتھی نہیں ہو؟“

میں نے کہا۔

”نہیں۔ مگر یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ ان لوگوں نے مجھے تمہارے پاس کر مقصد کے لئے بھیجا ہے؟ یہ بھی تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ آج رات نہیں تو کل رات تمہیں یہاں سے لے چلوں گا۔“

میں اس سے بڑی دھیمی آواز میں گفتگو کر رہا تھا۔ وہ بھی دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس نے نارنجی کمر کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ کانوں میں سونے کے بندے تھے۔ ناخنوں پر نیل پالش لگی تھی۔ اس کے لباس سے کسی نہایت اعلیٰ قسم کے غیر ملکی پرفیوم بڑی مدھم مدھم سی خوشبو آرہی تھی۔ لگتا تھا یہ پرفیوم دو روز پہلے اس نے لگایا ہو گا۔ تب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس کے ماتا پتا کہاں ہوتے ہیں۔ اس کا گھر کہاں ہے۔

لڑکی نے بتایا کہ اس کا نام شکنتلا دیوی ہے۔ اس کے پتاجی سورگباش ہو چکے ہیں۔ اس کی ماتا زندہ ہیں۔ ایک بڑا بھائی ہے۔ ان کی حویلی وہاں سے پچاس کوس کے فاصلے پر گوالیار جھانسی ریلوے ٹریک کے درمیان ریاست چھند واڑہ میں ہے۔ اس کا باپ ریاست کے راجہ کا دیوان تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ اپنی ماں اور بڑے بھائی کے ساتھ اپنی آبائی حویلی میں رہتی ہے۔ اس نے گوالیار کے ایک کالج سے انگریزی میں اے اے کیا ہوا ہے اور وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتی ہے۔ وہ کالی داس پر ایک کتاب لکھ رہی ہے۔ ریاست سے کچھ وظیفہ ملتا ہے۔ تھوڑی سی جاگیر ہے جس پر حویلی کے ملازموں کے علاوہ دوسرے اخراجات آسانی سے پورے ہو جاتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ حویلی سے تھوڑی دور ایک تالاب والا چھوٹا مندر ہے۔ وہ صبح کے وقت اشان کرنے کے پوجا کرنے کیلی تالاب پر گئی تھی کہ کچھ ڈاکو اچانک گھوڑوں پر سوار آ گئے۔ انہوں نے

اسے وہیں دبوچ کر گھوڑے پر ڈالا اور لے گئے۔

اپنی داستان مختصراً سنانے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور ان ڈاکوؤں کے پاس کیوں رہتا ہوں۔ میں نے کہا۔

”میرا نام دھرم دیر ہے۔ میرا ان ڈاکوؤں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں بھی ان میں پھنس گیا ہوں۔ میں خود یہاں سے فرار ہونے والا تھا۔ اب تم کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

شکنتلا نے پوچھا۔

”ان ڈاکوؤں نے تمہیں میرے پاس کس لئے بھیجا تھا؟“

میں نے اسے ساری بات بتادی۔ اس نے سرگھٹنوں پر ٹکا دیا اور گہری سانس لے کر کہنے لگی۔

”کیا میں اپنی ماتا جی اپنے بھیا جی کے پاس پہنچ سکوں گی؟“

اور میں نے چراغ کی روشنی میں اس کی غزال ایسی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو چمکتے دیکھے میں نے کہا۔

”جب میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا تو مجھ پر یقین رکھو۔ میں تمہیں یہاں سے ضرور لے جاؤں گا۔ آگے جو ہو گا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

وہ ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ میں نے سرنگ کے دہانے کی طرف دیکھا۔ سرنگ کے باہر دن کی روشنی میں ڈاکو بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے شکنتلا سے پوچھا۔

”کیا تمہیں یہاں سے اپنی حویلی کا راستہ معلوم ہے؟“

وہ بولی۔

”یہ لوگ مجھے کئی جنگلوں سے گزار کر یہاں لائے تھے۔ اس وقت رات ہو گئی تھی۔ مجھے اغوا کرنے کے بعد ایک جگہ چھپا کر رکھا گیا تھا۔ پھر جب رات کا اندھیرا ہو گیا تو یہ مجھے

لکھو ہنسنے لگا۔

”ارے سنا ہے ان کی بڑی حویلی ہے زمینداری ہے۔ زمین بیچ کر بھی وہ لوگ لاکھ روپیہ دے سکتے ہیں۔ کیا انہیں اپنی لڑکی کی عزت نہیں چاہئے؟“

میں نے کہا۔

”دادا! مجھے دو ایک دن کی مہلت دے دو۔ اس درمیان میں تم لوگ اپنے طور پر بھی لڑکی کے گھر والوں سے بات کرتے رہو۔“

لکھو سگریٹ کا کش لگا کر کہنے لگا۔

”چلو ہمیں کیا روپیہ نہیں دیتے تو نہ دیں ہمارا کیا ہے۔ ہم پہلے تو خود لڑکی سے عیش کریں گے۔ پھر بمبئی لے جا کر بیچ دیں گے اسے۔“

رامو چولہے کے پاس کچھ دور بیٹھا تھا۔ لکھو نے رامو سے اونچی آواز میں کہا۔

”اور رامو! دارو کا بندوبست کر رکھنا رے آج رات کو سبھا جئے گی۔“

لکھو نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”بابو! تم دارو ضرور پیتے ہو گے۔ آج رات تمہیں خالص برگد کی چھال کا دارو پلائیں گے۔“

میں نے جلدی سے کہا۔

”نہیں لکھو دادا! میری طبیعت پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی۔ دارو پی لیا تو طبیعت پھر بگڑ جائے گی۔“

”چلو تمہاری مرضی“

وہ اٹھ کر رامو کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ آج رات یہ ڈاکو لوگ شراب و کباب کی محفل گرم کرنے والے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ آج کی رات فرار ہونے کے لئے بڑی موزوں تھی۔ اس کے بعد خدا جانے یہ موقع ملتا ہے یا نہیں ملتا۔ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے میں نے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ یہ لوگ اپنے گھوڑے نیچے درختوں کے سائے میں باندھتے تھے۔ نیچے اس طرف سے بھی راستہ جاتا تھا اور اس جانب

وہاں سے لے کر چلے تھے۔ اتنا یاد ہے راستے میں ایک دریا کا پل آیا تھا اور اس پل پر سے ریل گاڑی گزری تھی۔ اتنا مجھے اندازہ ہے کہ میں اپنی حویلی سے چالیس پچاس میل کے فاصلے پر ہی ہوں۔ دریا کے ریلوے پل پر پہنچ جاؤں تو وہاں سے اپنی ریاست میں پہنچ سکتی ہوں۔“

میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے اب تم خاموشی سے بیٹھی رہو۔ اتنا تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری عزت پر کوئی شخص حملہ نہیں کرے گا۔ میں آج یا کل رات کو کسی بھی وقت آؤں گا۔ اور یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔“

میں خاموشی سے اٹھا اور سرنگ میں باہر کی طرف چل پڑا۔ اب مجھے یہ بھی پردا نہیں تھی کہ میرے پاس پیسے ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے۔ میں اس پڑھی لکھی شریف لڑکی کی عزت ان ڈاکوؤں سے ہر حالت میں بچانا چاہتا تھا۔ لڑکی نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس کے بھائی کے پاس ایک لاکھ روپیہ نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی ساری جائیداد اور زمینیں ساہوکار کے پاس پہلے ہی گردی پڑی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ڈاکو اور ان کے وہ ساتھی جو شکنتلا کو اغوا کر کے لائے تھے اس کی عزت برباد کر دیں گے اور وہ جیسا کہ اس نے کہا ہے خودکشی کر لے گی۔ میرے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایک لڑکی کی عزت درندوں کے ہاتھوں برباد ہو رہی ہو اور میں خاموش تماشا کی بنا رہوں۔

میں باہر درختوں کے پاس آیا تو لکھو چارپائی پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

”کیا کہتی ہے لڑکی؟“

میں اس کے پاس بیٹھ گیا میں نے کہا۔

”لکھو کا! لڑکی پڑھی لکھی ضرور ہے۔ مگر بڑی ہندی ہے۔ ابھی اپنے گھر خط لکھنے پر راضی نہیں ہو رہی۔ پر تم فکر نہ کرو۔ یہ بات تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اسے راضی کر لوں گا۔“

سے بھی راستہ جاتا تھا۔ جس جانب وہ سرنگ تھی جس میں شکنتلا کو قید کیا گیا تھا۔ مجھے اسی طرف سے رات کو شکنتلا کو نکالنا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ میں گھوڑے پہلے اس طرف والے درختوں سے کھولوں اور پھر انہیں دوسری طرف لے جاؤں۔ گھوڑوں کا خیال مجھے اس لئے آگیا تھا کہ اس جنگل کو میں دیکھ چکا تھا۔ یہ بڑا گھنا اور دشوار گزار جنگل تھا۔ جھاڑیاں درختوں میں اور درخت جھاڑیوں میں الجھے ہوئے تھے۔ آتی دفعہ مجھے لکھو اور اس کے ساتھی جس راستے سے لائے تھے وہ کوئی خاص شارٹ کٹ راستہ تھا۔ وہاں سے بھی گھوڑوں پر بیٹھ کر ہی آسانی سے گزرا جاسکتا تھا۔ یہ گوالیار جھانسی ریلوے کے وسط ہند کے جنگل تھے جو جنگلی درندوں اور دلدلوں، برساتی تالوں، گھاٹیوں اور حشرات الارض سے بھرے ہوئے تھے۔ اگر میں شکنتلا کو لے کر چلتا ہوں اور کچھ دیر بعد یہاں کسی کو ہمارے فرار کا علم ہو جاتا ہے تو یہ لوگ جنگل کے بھیدی ہونے کی وجہ سے ہمیں راستے میں ہی پکڑ سکتے تھے۔ ضروری تھا کہ یہاں سے فرار ہونے کے بعد جتنی جلدی جتنی دور نکل سکیں نکل جائیں۔ اس کے لئے گھوڑے بہترین سواری تھے۔ وہ گھنی جھاڑیوں سے بھی انسانوں کی نسبت زیادہ تیزی سے نکل سکتے تھے اور کھلی جگہ پر ہم انہیں دوڑا بھی سکتے تھے۔ خطرہ اگر تھا تو یہ تھا کہ گھوڑوں کو پکڑتے اور سرنگ کی دوسری طرف لاتے وقت وہ زور سے ہنسانا اور ٹاپیں مارنا نہ شروع کر دیں۔ کیونکہ میں ان کے لئے اجنبی تھا۔

شام ہو گئی تو ڈیرے میں درختوں کے نیچے شراب و کباب کی محفل کا اہتمام شروع ہو گیا۔ دونوں چولہوں پر جنگل سے مار کر لائے ہوئے ہرن کا گوشت پکنے لگا۔ رامو دوپہر کو ہی کسی قریبی گاؤں سے برگد کے چھال کی شراب لینے چلا گیا تھا۔ شام کو آیا تو کپڑے میں چھ بوتلیں باندھ کر گھوڑے کے آگے رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر ہمیں آج رات ہی نکلنا ہے تو کیوں نہ شکنتلا کو جا کر خبردار کر دوں کہ وہ تیار رہے ہم آج رات بھاگ رہے ہیں۔ میں آسانی کے ساتھ اس سے مل بھی سکتا تھا۔ میں نے لکھو دادا سے کہا کہ میں لڑکی کے پاس جا کر ایک بار پھر دباؤ ڈال کر کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے گھروالوں کے نام خط لکھ دے لکھو خوش ہو کر بولا۔

”ٹھاکر بابو! یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔ اس میں لڑکی کا ہی بھلا ہے۔ ورنہ اس کی بوٹی بھی اسے گھروالوں کے ہاتھ نہ آئے گی۔ ساری عمر اپنی بیٹی کے لئے روتے رہیں گے۔“ میں نے اپنے دل میں کہا۔ میرے خدا نے چاہا تو ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں سرنگ کی طرف جانے لگا تو لکھو بولا۔

”اسے بتا دینا کہ کل اگر اس نے خط لکھ کر نہ دیا تو پھر اس کے ساتھ وہ سلوک شروع ہو جائے گا جو تماش بین بد معاش عورتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہاں۔ جاؤ صبح میں گاؤں سے بڑے کانڈ اور پنسل بھی منگوا لوں گا۔ یہاں ہمارے پاس کانڈ نہیں ہے۔ کوئی پنسل قلم بھی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ کل تمہیں لڑکی کا خط مل جائے گا“

لکھو خوش خوش اس طرف چل دیا جدھر درختوں کے نیچے دری بچھ گئی تھی۔ شراب کی بوتلیں رکھ دی گئی تھیں اور کانسی کے چھوٹے گلاس بھی آگئے تھے۔ تقریباً سارے آدمی وہاں جمع ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے اور گوشت پکتا دیکھ رہے تھے۔

میں خاموش خاموش جیسے بادل خواستہ چلتا سرنگ کی طرف ہو گیا۔ سرنگ کے باہر ایک ڈاکو برابر پہرے پر موجود تھا۔ مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔ اسے میں بڑی آسانی سے رات کے وقت قابو کر سکتا تھا۔ اگر مجھے کمانڈو آپریشن کرنا ہوتا تو یہ سارے لوگ میرے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھے۔ لیکن ان لوگوں نے میرے ساتھ بڑا ایثار کیا تھا۔ خواہ اپنے لالچ کے لئے ہی سہی لیکن میں ان کے حسن سلوک اور مہمان نوازی کا بدلہ ان لوگوں کی گردنیں توڑ کر نہیں دینا چاہتا تھا۔

سرنگ کے باہر پہرہ دینے والے نے مجھے دیکھا اور خاموش رہا۔ میں سرنگ میں چلا گیا۔ شکنتلا صف پر دیوار کی طرف منہ کئے پڑی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ چراغ جل رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو چہرے کی پریشانی قدرے دور ہو گئی۔

بازو سامنے کی جانب سے اس کی ٹھوڑی کے اوپر اس کی گردن میں ڈال دیا۔ اگر میں اسے زور سے جھٹکا دیتا تو اس کی گردن فوراً ٹوٹ جاتی۔ مگر میں اسے ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے پکڑنا اور قانون کے مطابق سزا دینا اس علاقے کی پولیس کا کام تھا۔ وہ میرا دشمن نہیں تھا۔ وہ میرے مقابلے پر نہیں اترتا تھا۔ وہ میرے راستے میں حائل ہوا تھا اور میں اسے ہلاک کئے بغیر اپنے راستے سے ہٹا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی گردن کو اپنے بازوؤں میں دبوج کر صرف اتنی دیر کے لئے اس کے پھیپھڑوں میں جانے والی آکسیجن بند کر دی جتنی دیر میں وہ صرف بے ہوش ہو سکتا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے تو میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اس کی بندوق دور جھاڑیوں میں پھینک دی پھر اس کے سر پر بندھا ہوا صافہ اتار کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا کہ اگر اسے ہوش آ بھی جائے تو وہ فوری طور پر شور نہ مچا سکے۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں دوڑ کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔ شکنتلا جاگ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا

”میرے ساتھ آ جاؤ“

وہ میرے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ ہم ٹیلے کے نشیب سے اتر کر گھوڑے کے پاس آئے۔ میں نے اسے سہارا دے کر گھوڑے پر بٹھایا۔ رائفل کاندھے پر ڈالی۔ خود اس کے آگے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور گھوڑے کو چلاتا ہوا جنوب کی جانب اترائی پر ڈال دیا۔ شکنتلا میرے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بیٹھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ گھوڑے پر بیٹھنے کی عادی ہے۔ ٹیلے کی اترائی نیچے دور تک چلی گئی تھی۔ پھر ہموار میدانی جنگل شروع ہو گیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا میں نے شکنتلا سے پوچھا۔

”ہم ٹھیک سمت پر جا رہے ہیں ناں؟“

اس نے کہا۔

”میرا خیال ہے ٹھیک جا رہے ہیں“

راستے میں ایک بار میں نے اس سے انگریزی میں بات کی تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

”تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ ان ڈاکوؤں میں کیسے آگئے؟“

میں نے انگریزی میں ہی جواب دیا۔

”یہ تمہیں پھر کبھی بتا دوں گا“

گھوڑا اندھیرے میں درختوں اور جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس میں سے اس طرح گزر رہا تھا۔ جیسے وہ اس قسم کے دشوار گزار راستوں کا عادی ہو۔ وہ کسی جگہ رکا نہیں تھا۔ میں اسے دوڑا نہیں سکتا تھا۔ اسے دوڑانے کے لئے وہاں کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن گھوڑے کو میں جتنی تیز چلا سکتا تھا چلا رہا تھا۔ اپنے قیاس کے مطابق میں اپنی سمت کو مغرب کی طرف برقرار رکھے ہوئے تھا۔ درخت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ آگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں پتھر زمین سے باہر نکل آئے تھے جن پر چلنے سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ مگر اب ہم ڈاکوؤں کی کہیں گاہ سے دور نکل آئے تھے۔

”یہی دریا ہے۔ ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔

”اگر تھک گئی ہو تو ہم گھوڑے سے اتر آتے ہیں۔“

شکنتلا بولی۔

”نہیں میں گھوڑ سواری کی عادی ہوں۔ جب پتا جی زندہ تھے تو میں ان کے ساتھ روز صبح صبح گھوڑ سواری کے لئے جایا کرتی تھی۔ اب تو ہمارے پاس صرف بگھی کے دو گھوڑے ہی رہ گئے ہیں۔“

ہم دریا کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے دور نظر جما کر دیکھا۔ مجھے دریا کے اوپر ایک سیاہ لکیری نظر آئی۔ میں نے شکنتلا سے کہا۔

”میرا خیال ہے وہ سامنے ریل کا پل ہے“

شکنتلا نے میرے پیچھے سے گردن نکال کر سامنے کی جانب دیکھا اور کہا۔

”ہاں۔ یہ ریلوے برج ہی ہے۔ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔ اس پل کی دوسری طرف راجواڑے کا جنگل شروع ہوتا ہے“

میں گھوڑے کو دکی چلانے لگا۔ ریلوے پل اندھیرے میں واضح ہوتا جا رہا تھا۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ ریلوے پل کے پاس آکر ہم گھوڑے سے اتر آئے۔ اس پل پر ایک طرف ریلوے لائن بچھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پیدل چلنے کا راستہ تھا۔ درمیان میں کافی اونچا لوہے کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ ہم گھوڑے کو لے کر پیدل چلنے والے راستے پر چلنے لگے۔ ہماری بائیں جانب نیچے دریا نظر آ رہا تھا۔ پل کے ستونوں کے پاس سے گزرتے تو دریا کی موجوں کا ستونوں سے ٹکرانے کا شور سنائی دیتا۔ رات کی خاموشی اور تاریکی میں دریا کی موجوں کا شور میرے دل میں خدائے ذوالجلال کی عظمت و ہیبت کا احساس پیدا کر رہا تھا۔

ہم پل پار کر کے دوسری طرف اتر گئے۔

شکنتلا یہاں رک گئی۔ وہ سامنے اور دائیں جانب دیکھنے لگی۔ اس نے ایک

گھنے درختوں کی وجہ سے رات کی تاریکی زیادہ گہری تھی۔ گھوڑے کو چلاتے ہم ڈاکوؤں کی سرنگ سے کافی دور نکل آئے تھے۔ گھنا جنگل تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ آسمان پر جھللاتے ستارے نظر آنے لگے تھے۔ ان کی پھیکی پھیکی روشنی میں منظر بھی تھوڑا بھوڑا نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک کھلا میدان تھا۔ میں نے شکنتلا سے اس میدان کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ میں نے اس جگہ کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ دریا آئے گا تو میں تمہیں اپنے قبضے کا راستہ بتا سکوں گی“

میں گھوڑے کو دوڑانے لگا۔ میدان ختم ہوا تو ایک اور جنگل شروع ہو گیا۔ مگر اس جنگل میں درخت اتنے گنجان اور ساتھ ساتھ آگے ہوئے نہیں تھے۔ اندھیرے میں ان کے اونچے اونچے تنے سیاہ ستونوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں سیاہ کالی چٹانیں بھی تھیں۔ ایک پہاڑی نالہ آگیا۔ ہم اس میں گھوڑا گزار کر لے گئے۔ کوئی آدھا گھنٹہ ہم اس جنگل میں گھوڑا چلاتے رہے۔ سامنے سے ہوا کا جھونکا آیا تو اس میں نمی محسوس ہوئی۔ میں نے شکنتلا سے کہا۔

”شاید آگے دریا آ رہا ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ درختوں سے باہر آئے۔ تو سامنے دریا کا پاٹ دکھائی دینے لگا۔ کافی بڑا دریا تھا۔ رات کے اندھیرے اور ستاروں کی پھیکی روشنی میں خاموشی سے بہتے ہوئے دریا میں ایک عجیب سی دہشت اور جلال ہوتا ہے۔ شکنتلا بولی۔

کام لیتے ہیں۔ کہنے لگا۔

”بس کچھ نہ کچھ ہم بھی کر رہے ہیں“

اس کے بعد اس نے موضوع بدل کر دوسری باتیں شروع کر دیں۔ میں سمجھ گیا کہ اس آدمی سے راز معلوم کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ مجھے بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں بھارتی فوج کے پیٹ کے اندر پہنچ چکا تھا۔ میں صبر سے کام لے سکتا تھا۔

میجر شرت دیوان کے ہوٹل میں کبھی کبھی شام کے وقت اس کے فوجی دوست بھی آکر بیٹھتے تھے۔ شراب کا دور بھی چلتا تھا۔ ان فوجیوں کا تعلق زیادہ تر ملٹری انٹیلی جینس سے ہوتا تھا۔ یہ لوگ شراب پی کر بھی فوجی معاملات پر گفتگو کرتے وقت مجھے دیکھ کر محتاط انداز اختیار کر لیتے تھے۔ مگر میں نے اپنے رویے اور پاکستان کے خلاف باتیں کرتے رہنے سے ان کو اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔ یہ فوجی کچھ اس وجہ سے بھی مجھے بڑا دلچسپ اور ایڈونچرس نوجوان سمجھتے تھے کہ میں میجر شرت کی بہن کو ڈاکوؤں کی کمین گاہ سے نکال کر لے آیا تھا۔

مجھے ناگ پور کے فوجی ہیڈ کوارٹر کی کنٹین پر کام کرتے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا تھا اور ابھی تک میں سری نگر میں اپنے کشمیری کمانڈو لیڈر شیردان کو اپنے بارے میں کوئی اطلاع نہیں پہنچا سکا تھا۔ میں نے یہ دیکھا تھا کہ میجر شرت اپنا موبائل ریڈیو ٹرانسمیٹر اپنے کمرے کے کلوژٹ میں رکھتا تھا۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کر لی تھی۔ میں اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے موقع پا کر کمانڈر شیردان کو اپنے خاص خفیہ کوڈ میں سری نگر پر پیغام بھجوا سکتا تھا کہ میں ناگ پور کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں پہنچ چکا ہوں۔ لیکن یہ کوئی اتنا ضروری پیغام نہیں تھا جس کے لئے میں کوئی خطرہ مول لیتا۔ کیونکہ یہ مجھے معلوم تھا کہ فوجی ہیڈ کوارٹر سے کوئی سگنل نشر ہوا تو خواہ وہ خفیہ کوڈ میں ہی ہو ہیڈ کوارٹر کے سگنل کور کی مانیٹرنگ ٹیم کو اس کا علم ضرور ہو جائے گا۔ میں یہ خطرہ صرف اس صورت میں مول لے سکتا تھا جب مجھے کوئی انتہائی اہم فوجی راز معلوم ہو جاتا۔

اور قدرت نے بہت جلد مجھے یہ موقع بھی فراہم کر دیا۔ ایک روز شام کے وقت میجر

شرت دیوان کے کمرے میں شراب و کباب کی محفل گرم تھی۔ وہاں انٹیلی جینس کور کا ایک سکھ کیپٹن بھی بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ یہ لوگ کافی شراب پی گئے تھے اور زبان پر انہیں قابو نہیں رہا تھا۔ میں جان بوجھ کر دوسری طرف ہو کر لکڑی کے کرٹ میں میجر شرت کی وردی تہہ کر کے رکھنے لگا۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ مجھے ان کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کچھ وہ لوگ بھی غافل ہو چکے تھے۔ اتنے میں انٹیلی جینس کور کے سکھ کیپٹن کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جس پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے کہا تھا۔

”اس بار ہم پاکستان کا نام نقشے پر سے ہٹا دیں گے اور بھارت ماتا کے پھڑے ہوئے کلکڑوں کو جوڑ کر اس غلطی کا ازالہ کر دیں گے جو پنڈت نہرو نے انڈیا کو تقسیم کر کے کی تھی۔“

وہاں ایک لیفٹیننٹ، ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ اور میجر شرت دیوان بھی بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ یہ لوگ نشے میں بہت زیادہ ہلکے جانے کے باوجود محتاط تھے۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے چہرہ نیچے کر لیا اور کرٹ میں وردی جمانے لگا۔ اسی لیفٹیننٹ نے سکھ کیپٹن سے پوچھا۔

”سرا کیا کوئی ڈیڈ لائن مقرر ہوئی ہے۔“

اس اہم فیصلے کی کچھ تفصیلات معلوم نہیں ہو جاتیں۔ میرے لئے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا کہ بھارت اگر پاکستان پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو یہ حملہ کس مہینے کرے گا اور کونسی تاریخ کو کرے گا اور حملے کی حکمت عملی کیا ہوگی۔ یہ فوجی معلومات انتہائی راز والی تھیں اور اگر کوئی شخص اس سلسلے میں مجھے کچھ بتا سکتا تھا تو وہ شکنتلا کا بھائی میجر شرت دیوان ہی تھا۔

چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ فوجی راز میں اس سے معلوم کر کے رہوں گا۔ مجھے اس کا اعتماد حاصل تھا۔ میں اپنی باتوں سے اس پر یہ ثابت کر چکا تھا کہ میں بھارت ماتا کا سچا پیجاری ہوں اور پاکستان کو بھارت کا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ میجر شرت کو اگر پاکستان پر فوجی حملے کی تاریخ کا علم ہو گا تو وہ مجھے اتنی آسانی سے یہ راز بتا دے گا۔ اس کے لئے مجھے انتہائی دانشمندی، احتیاط، چالاکی اور کسی خاص حکمت عملی سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ میں یہ دیکھ چکا تھا کہ میجر شرت دیوان کو اعلیٰ سے اعلیٰ شراب پینے کا شوق ہے اور وہ ہر روز شام کو قیمتی شراب کے تین چار جام ضرور پیتا ہے۔ اس نے ایک دن مجھے کہا تھا۔

”دھرم ویر! جس رات کو شراب نہ پیوں اچھی طرح سے نیند نہیں آتی۔ ہماری رجنٹ کے میڈیکل آفیسر نے بھی مجھے کہا ہے کہ میں رات کو سونے سے پہلے اچھی سکاچ و سکی کے دو تین پیگ ضرور پی لیا کروں۔ مگر یہاں سوائے وائٹ ہارس اور واٹ ۶۹ کے دوسری کوئی اعلیٰ سکاچ نہیں ملتی۔“

یہ بات میرے ذہن میں تھی۔

ہفتے کے دن ہماری ملٹری کنٹین میں راشن کی سپلائی آئی تو اس میں سکاچ و ہسکی ڈمپل سکاٹ کے دو کریٹ بھی تھے۔ ڈمپل سکاٹ کا شمار بہت اونچے درجے کی سکاچ و ہسکی میں ہوتا ہے۔ میں نے فوراً اس میں سے ڈمپل سکاٹ کی ایک بوتل کا ڈبہ نکال کر الگ رکھ لیا۔ شام کو جب میں ڈیوٹی سے فارغ ہوا تو میں نے ڈبہ لفافے میں ڈالا اور میجر شرت کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ میجر شرت جس آفیسر

سکھ کیپٹن نے شراب کا ہلکا سا گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔

”اس کا فیصلہ تو ہماری منسٹری آف ڈیفنس ہی کرے گا۔ لیکن ہماری انٹیلی جینس کو پاکستان کی ڈیفنس لائن کی پوری رپورٹ جلد سے جلد مہیا کرنے کے آرڈر مل گئے ہیں۔“

میجر شرت دیوان نے اپنا گلاس میز پر نکاتے ہوئے کہا۔

”ہم یہ رپورٹ ہائی کمانڈ کو ایک ہفتے کے اندر اندر پہنچا رہے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی جیسے سکھ کیپٹن اپنے ہوش میں آگیا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

”نوسیکرٹ ٹاک پلینز۔ فارگٹ اٹ۔“

اور انہوں نے موضوع بدل دیا۔ وہ فلم ایکٹرس اور دوسری عورتوں کی باتیں کرنے لگے۔ اس دوران سیکنڈ لیفٹیننٹ نے کوئی فلمی گیت گانا شروع کر دیا۔ یہ محفل رات کے گیارہ بجے تک جاری رہی۔ اس کے بعد سب چلے گئے۔ میں بھی میجر شرت سے اجازت لے کر واپس چلا آیا۔ اپنے کمرے میں آکر میں اپنی فوجی کیمپ کارٹ پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سکھ کیپٹن نے جو بات کی تھی یا اس کی زبان سے نکل گئی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ بھارت کی فوجی ہائی کمانڈ نے پاکستان پر کسی حملے کا منصوبہ بنا لیا ہے اور اسے انڈین ڈیفنس منسٹری کی منظوری بھی حاصل ہے۔ یہ بڑا اہم فوجی راز تھا جو مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ یہ راز مجھے ان فوجی افسروں سے ہی حاصل ہو سکتا تھا جن کا تعلق ملٹری کی انٹیلی جینس کور سے تھا۔ دوسری کسی جگہ سے میں یہ راز حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ میں یہ راز کمانڈو لیڈر شیروان کو اس وقت تک نہیں بتانا چاہتا تھا جب تک مجھے انڈین ملٹری ہائی کمانڈ کے

چھوڑتے ہوئے کہا۔

”ہم پاکستان کو اس طرح اڑا دیں گے۔“

اور اس نے زور سے پھونک مار کر سگار کے دھوئیں کو ادھر ادھر اڑا دیا۔ میں نے کہا۔

”بھیا! مگر ہمارا تو کوئی ملک دوست نہیں ہے۔ پاکستان کی تو سارے مسلمان ملک مدد کریں گے۔ ہماری کون مدد کرے گا؟“

اصل بات یہ تھی کہ میجر شرت دیوان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس کے سامنے جو آدمی بیٹھا ہوا ہے وہ دھرم ویر نام کا کوئی بے ضرر سا ہندو نہیں ہے بلکہ ایک تربیت یافتہ مسلمان کمانڈر اور تحریک آزادی کشمیر کا مجاہد ہے۔ وہ مجھے اپنے گھر کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا اور میں نے ان کے خاندان کے ساتھ جو ایثار کیا تھا اس کے بعد اسے ایسا سمجھنا ہی چاہئے تھا۔ پھر میرا ان لوگوں کے ساتھ رویہ ایسا رہا تھا کہ کسی کو مجھ پر ذرا سا بھی شک نہیں پڑ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میجر شرت دیوان میرے ساتھ کھل کر بات کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے کسی قریب ترین دوست کے آگے بھی یہ باتیں نہ کرتا۔ میرے سامنے اس لئے کر رہا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ میری یہاں کسی سے دوستی وغیرہ ہی نہیں ہے اور میں اس کے سوا اور کسی سے ناگ پور میں ملتا جلتا بھی نہیں ہوں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اس کے گھر کے ایک فرد کی طرح تھا۔ جب میں نے سوچی سمجھی سکیم کے مطابق یہ کہا کہ جنگ کی صورت میں ہماری مدد کو نسا ملک آئے گا تو اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ پھر ہوا میں ایک ہاتھ کو دور سے لہرا کر انگریزی میں کہنے لگا۔

”امریکہ آئے گا۔ اسرائیل آئے گا۔ اسرائیل کے پاس اس وقت ملٹری کی جدید ترین ٹیکنالوجی موجود ہے۔ وہ ہمارا کھلا دوست ہے۔ امریکہ نے پردے کے پیچھے ہمارے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے رکھا ہے۔ اس نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ تم پاکستان پر انیک کرو۔ ہم تمہیں اسرائیل کے ذریعے ہر قسم کا اسلحہ کی سپلائی بھی ختم نہ ہونے دیں گے۔“

میں نے اٹھ کر میجر شرت کا ہاتھ چوم لیا اور بے انتہا خوش ہو جانے کی اداکاری

کرتے ہوئے کہا۔

”بھیا! بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔ تم نے میرا دل شیر جتنا بڑا کر دیا ہے۔ بس اب مجھے کوئی فکر نہیں رہا۔“

پھر جیسے ایک دم پریشان ہو کر کہا۔

”لیکن بھیا! اسرائیل کے جہاز ہمارے لئے گولہ بارود اور دوسرا جنگی سامان لے کر آئیں گے تو دوسرے ملکوں کے سفارت کاروں کو خاص طور پر پاکستان کے سفارت خانے والوں کو پتہ چل جائے گا۔“

میجر شرت دیوان نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات کہہ ڈالی جو ملٹری انٹیلی جنس کا ایک ذمہ دار افسر ہونے کی حیثیت سے اسے کبھی اور کسی حالت میں نہیں کہنی چاہئے تھی۔ اس نے کہا۔

”دھرم ویر! اس وقت امریکی اسلحہ سے لدے ہوئے اسرائیل کے دو مال بردار بحری جہاز ہماری ترچنا پٹی پورٹ سے دس میل دور جیا گام کی کھاڑی میں کھڑے ہیں۔ ان میں اسرائیل کا دیا ہوا جدید ترین خطرناک میزائل مارٹر گنیں اور ایسے ہائی ٹیک ریڈار بھی ہیں جو دشمن کے نیچے سے نیچے پرواز کرتے بمبار اور فائٹر طیاروں کا بھی سراغ لگالیتے ہیں۔ اور یہ ابھی پہلی کھیپ ہے دوسری کھیپ اگلے مہینے پہنچنے والی ہے۔“

میں نے مصنوعی جوش میں آکر کہا۔

”بھیا شرت جی! ہمیں پاکستان پر ایٹم بم چلا دینا چاہئے۔“

میجر شرت نے اپنی انگلی اٹھا کر ہونٹوں کے پاس لے جا کر انگریزی میں کہا۔

”بس دھرم ویر! اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہ بھی تم میرے بھائیوں سے بھی زیادہ مجھے عزیز ہو اس لئے تمہیں اتنا بتا دیا۔ بس اب بے خوف ہو کر اپنا کام کرو۔ بہت جلد ہم دونوں لاہور کی انارکلی میں چل پھر رہے ہوں گے۔“

میں نے بھی مصلحتاً اس کے آگے کچھ نہ پوچھا۔ اس شخص نے مجھے جتنا بتا دیا تھا وہ کافی سے زیادہ تھا اور مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ ایک ملٹری انٹیلی جنس آفیسر سے اتنی

چھوٹم ترین معلومات فراہم ہو جائیں گی۔ اگرچہ مجھے یہ معلوم کرنے کی بھی ضرورت تھی کہ اسرائیل کے جو جہاز مال بردار جہازوں کے جیس میں پاکستان کے خلاف استعمال ہونے والا اسلحہ وغیرہ لے کر آئے ہیں ان کے ارد گرد سیکورٹی کا انتظام کس طرح کا ہے اور جیا گام کی کھاڑی ترچنا پلی کی بندرگاہ سے کس جانب ہے۔ لیکن میں نے اس وقت مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ اور میجر کے لئے کباب گرم کرنے کچن میں چلا گیا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد میں میجر شرت دیوان کے ہوٹل سے واپس اپنے کمرے میں آیا تو میرا ذہن بھرا ہوا تھا۔ طرح طرح کی سکیمیں ذہن میں آرہی تھیں۔ مجھے ان جہازوں کو جو پاکستان کے خلاف جنگ میں استعمال ہونے والا خطرناک ترین اسلحہ اور دوسرا جدید ترین نیکنالوجی کا حامل فوجی سازو سامان لے کر بھارت کی ترچنا پلی کی بندرگاہ کے قریب لنگر انداز ہوئے تھے۔ ہر حالت میں غرق کرنا اور دھماکے سے اڑا دینا تھا۔ اس کے لئے مجھے ایک ساتھی کمانڈو کی ضرورت تھی اور یہ ساتھی کمانڈو کشمیر کا مجاہد سرفروش کمانڈو اورنگ زیب ہی ہو سکتا تھا۔ اورنگ زیب واقعی ایک تربیت یافتہ انتہائی ڈسپلن کا پابند اور نڈر کشمیری کمانڈو تھا۔

میں سگریٹ اس قسم کے لمحات میں ہی عام طور پر پیتا تھا۔ میں نے سرہانے کے نیچے سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگالیا۔ پہلے خیال آیا کہ موقع دیکھ کر میجر شرت کے ٹرانسپیر سے کمانڈر شیروان کو یہ ساری باتیں خفیہ کوڈ میں بتادوں اور اسے کہوں کہ وہ کمانڈو اورنگ زیب کو ناگ پور روانہ کر دے۔ پھر خیال آیا کہ معلومات اتنی اہم، نازک اور زیادہ تھیں کہ ٹرانسپیر پر یہ ساری باتیں میں تفصیل سے بیان نہیں کر سکتا تھا۔ ٹرانسپیر پر کمانڈو ہمیشہ انتہائی ضرورت کے وقت اور انتہائی مختصر الفاظ میں بات کرتے ہیں۔ دشمن کے ملک میں رہ کر ٹرانسپیر پر زیادہ لمبی گفتگو کی جائے تو سگنلز کے پکڑے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے خود سری نگر جاکر کمانڈو شیروان اور کمانڈو اورنگ زیب سے ملنا چاہئے تاکہ تمام باتیں میں انہیں تفصیل کے ساتھ زبانی بیان کر سکوں اور کمانڈو اورنگ زیب کو بھی اپنے ساتھ ہی لے آؤں۔ پھر

ہم دونوں اپنے نئے کمانڈو مشن پر روانہ ہو جائیں گے۔ میں نے اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے اپنی مونچھیں بڑھانی شروع کر دی تھیں۔ میجر شرت نے ایک بار مجھ سے مونچھوں کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

”بھیا! میں اپنے چہرے پر راجپوت بہادروں والی شان پیدا کرنا چاہتا ہوں“

اس فیصلے کے بعد میں نے ایک دن گزار دیا۔ فوجی کنٹین سے ڈھیل سکاٹ کی بوتلوں کے دونوں کریٹ میں نے وعدے کے مطابق اٹھوا کر میجر شرت دیوان کے کمرے میں پہنچا دیئے۔ دوسرے دن رات کو میں اس سے ملاقات کرنے گیا تو وہ ایک عورت کے ساتھ بیٹھا ڈھیل سکاٹ پی رہا تھا۔ اس نے میرا اس عورت سے تعارف کروایا۔ اس پر کشش جسم والی اس عورت نے فالسے رنگ کی باریک ساڑھی پن رکھی تھی۔ جس میں سے اس کا بلاؤز اور جسم جگہ جگہ سے جھانک رہا تھا۔ یہ عورت انڈیا کی ایئر کمپنی میں کام کرتی تھی۔ ابھی ان لوگوں نے شراب شروع ہی کی تھی۔ میجر شرت نے ڈھیل سکاٹ کے کریٹوں کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے کہا۔

”بھیا! یہ تو میری ڈیوٹی تھی“

عورت ایک پیگ پینے کے بعد بیڈ روم میں چلی گئی۔ تو میں نے میجر شرت سے کہا۔

”بھیا! ماتمی کی سادھ پر جانے کو بڑا دل چاہتا ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں کچھ روز کے لئے امرتسر چلا جاؤں“

میجر شرت نے ڈبے میں سے سگار نکالتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں دھرم ویر ضرور جاؤ۔ میں تمہاری چھٹی منظور کراؤں گا۔ میں تمہیکیدار مہتہ سے خود بول دوں گا۔ کتنے دن کے لئے امرتسر جانا چاہتے ہو؟“

میں ذہن میں اندازہ لگانے لگا کہ سری نگر جانے، وہاں سے کمانڈو اورنگ زیب کو ساتھ لے کر ترچنا پلی تک پہنچنے اور کمانڈو ایکشن مکمل کرنے میں کتنے دن لگ سکتے ہیں۔

اور غلط نہیں ہو سکتی۔ اور میرا خیال ہے کہ ہماری انٹیلی جنس نے یہ رپورٹ پاکستان پہنچا دی ہوگی۔“

کمانڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

”تم نے ان اسرائیلی جہازوں کو ڈوبنے کی کوئی سٹرٹجی تیار کی ہے؟“

میں نے کہا۔

”سٹرٹجی وہاں چل کر تیار کر لیں گے۔ اس وقت میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ کیونکہ یہ اکیلے کمانڈو کا مشن نہیں ہے۔ اس کے لئے مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟“

کمانڈو اورنگ زیب نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگایا اور بولا۔

”ضرور چلوں گا۔“

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

”لیکن ہمیں اس مشن کا یہاں سے پورا انتظام کر کے چلنا ہوگا۔ کیونکہ ترجنا پلی ہمارے لئے ایک نیا شہر ہے۔ وہاں ہم کسی کو نہیں جانتے اور ان کی تامل زبان سے بھی ناواقف ہیں۔“

کمانڈو شیروان بولا۔

”تم لوگوں کو جس چیز کی ضرورت ہو بتاؤ۔ وہ تمہیں مہیا کر دی جائے گی۔“

میں نے کہا۔

”سب سے اہم چیز جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی اور زیادہ سے زیادہ دھماکہ خیز ڈیوائس ہے۔ یہ اتنی طاقتور ہونی چاہئے کہ فولاد کی مضبوط چادر کو بھی پھاڑ ڈالے۔“

کمانڈو شیروان نے کہا۔

”اس کا انتظام ہو جائے گا۔“

جینس کور کے میجر شرت دیوان کے زیر سایہ ناگ پور کے فوجی ہیڈ کوارٹر کی کنٹین پر کام کر رہا ہوں میں نے کہا۔

”یہ بات خود مجھے میجر شرت دیوان نے بتائی ہے جو ایک ذمے دار افسر ہے۔ اس کی تائید ملٹری انٹیلی جنس کا ایک سکھ کیپٹن بھی کر چکا ہے۔“

اس کے بعد میں نے انہیں اسرائیل کے ان دو ٹرانسپورٹ بحری جہازوں کے بارے میں بتایا جو بھاری تعداد میں امریکی اور اسرائیلی اسلحہ لے کر آئے تھے میں نے کہا۔

”یہ دونوں مال بردار جہاز اس وقت انڈیا کے مشرقی ساحل کی بندرگاہ ترجنا پلی کی ایک سمندری کھاڑی سے چند میل کے فاصلے پر چٹانوں کی اوٹ میں لنگر انداز ہیں۔ ملٹری انٹیلی جنس کی خفیہ اطلاعات کے مطابق ان میں دور مار میزائلوں اور جدید ترین نیکالوجی کے حامل فضا میں مار کرنے والے راکٹوں کے علاوہ ایسے امریکی ریڈار بھی ہیں جو نیچی سے نیچی پرواز کرنے والے فائٹر اور بمبار جہازوں کی بھی نشان دہی کر دیتے ہیں۔ یہ سارا اسلحہ پاکستان اور کشمیر میں ہماری تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے استعمال ہوگا۔ ہمیں ان دونوں جہازوں کو وہیں سمندر میں تباہ کر کے ڈبو دینا ہے۔ یہ اسلحہ کی پہلی امریکی اور اسرائیلی کھیپ ہے۔ جب دوسری کھیپ آئے گی تو اسے بھی نیست و نابود کرنے کی کوشش کریں گے۔“

کمانڈو شیروان اور کمانڈو اورنگ زیب میری بات بڑے غور سے سن رہے تھے۔ شیروان نے کہا۔

”یہ مشن بہت ضروری ہے۔ ہمیں ہر حالت میں ان جہازوں کو تباہ کرنا ہوگا۔ ان سے ہماری تحریک آزادی اور خاص طور پر پاکستان کو شدید خطرہ لاحق ہے“

پھر اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”کیا یہ رپورٹ صحیح ہے کہ بھارت پاکستان پر حملے کا منصوبہ تیار کر چکا ہے“

میں نے کہا۔

”یہ انڈین ملٹری انٹیلی جنس کی خفیہ رپورٹ ہے جو میں نے آپ کو بیان کی ہے۔“

میں نے کہا۔

”باقی جس قسم کے اسلحہ مثلاً آٹومیک پستول، گرنیڈ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے میں ناگ پور ہیڈ کوارٹر کے ایمونیشن ڈپو سے اڑانے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہاں سے نہ اڑا سکا تو بھجڑ شرت کا آٹومیک پستول تو میں کسی بھی وقت اپنے قبضے میں کر سکتا ہوں۔“

کمانڈو اورنگ زیب نے سوال کیا۔

”ترچنا پلی میں کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم اپنی خفیہ کمیں گاہ بنا سکیں؟“

میں نے کہا۔

”اسکا بندوبست ہمیں وہاں جا کر وہاں کے ماحول کا جائزہ لینے کے بعد کرنا پڑے گا۔ یہ شہر میرے لئے بھی نیا ہے۔ مگر میں تامل ناڈو کے صوبے کے لوگوں کے مزاج سے واقف ہوں۔“

کمانڈو شیروان بولا۔

”ہمیں کب اپنے کمانڈو مشن پر روانہ ہونا چاہئے؟“

میں نے کہا۔

”میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کرنا چاہتا۔ میری خفیہ اطلاع کے مطابق پاکستان اور کشمیر کے خلاف استعمال ہونے والا اسلحہ اور خطرناک فوجی ساز و سامان ابھی تک اسرائیلی بحری جہازوں پر ہی لدا ہوا ہے۔ انہیں اتار کر ایمونیشن میں بھی ڈمپ کیا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں یہ اسلحہ تباہ کرنا ہمارے لئے مزید مشکل ہو جائے گا۔“

شیروان نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم مجھے صرف کل کی مہلت دے دو تاکہ میں اپنے خاص آدمی کے پاس جا کر تمہارے لئے دھماکہ خیز ڈیوائس وغیرہ کا انتظام کر سکوں۔“

میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم پرسوں روانہ ہو جائیں گے۔“

اس کے بعد میں نے حاجی ثناء اللہ ڈار کی بیٹی پروین کے بارے میں پوچھا کہ کیا وہ خیریت سے پہنچ گئی تھی اور اس کے جواب میں بھارتی فوج نے یہاں کیا کیا ظالمانہ کارروائیاں کی ہیں۔

شیروان نے کہا۔

”بھارتی فوج کی غاصبانہ کارروائیاں تو جاری ہی رہتی ہیں اور ہم ان کا منہ توڑ جواب بھی دیتے رہتے ہیں۔ ہمارے دو آدمی شہید ہوتے ہیں تو ہم بھارتی فوج کے تین سپاہی ہلاک کر دیتے ہیں۔ حاجی صاحب کی بیٹی خیریت سے پہنچ گئی تھی۔ تم لوگوں کا کمانڈو آپریشن بڑا کامیاب رہا۔“

شام کو کمانڈو شیروان اپنے خاص آدمی سے ملنے چلا گیا جو دھماکہ خیز اسلحہ وغیرہ بنانے کا ماہر تھا۔ وہ رات گئے واپس آیا۔ صبح اس نے مجھے دیا سلائی کی ماچس کی ڈبیا کے ساز کے بارہ ڈیوائس دیئے اور کہا۔

”ان میں سے ہر بم میں اتنی طاقت ہے کہ پھٹنے کے بعد یہ بارہ انچ موٹی فولاد کی چادر کو بھی پھاڑ سکتا ہے۔ ان میں میگنٹ بھی ہے۔ یہ لوہے کی کسی بھی شے سے چپک جائے گا۔“

میں ماچس کے ساز کے ان بموں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کمانڈو شیروان بولا۔

”ہر بم میں ایک چھوٹا سا ہک باہر نکلا ہوا ہے۔ اس بم کو ٹارگٹ پر لگانے کے بعد تمہیں صرف اس ہک کو نیچے کر دینا ہو گا۔ ہک نیچے ہو جانے کے آدھے گھنٹے بعد یہ بم پھٹ جائے گا۔“

کمانڈو اورنگ زیب بھی ان ماچس بموں کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”میرے خیال میں آدھے گھنٹے کا وقفہ مناسب رہے گا۔“

میں نے کہا۔

”ہاں۔ اس لئے کہ یہ بم ہمیں سمندر کے اندر ہی اندر تیر کر جہازوں کے نیچے جا کر ان کے پیندوں سے چپکانے ہوں گے۔ میری سکیم تو یہی ہے آگے جو خدا کو منظور جس

قسم کی صورت حال پیدا ہوگی اس کے مطابق منصوبہ تیار کر لیں گے۔ ہمیں اپنے کمانڈو لباس کی ضرورت ہوگی۔ لیکن یہ ہم اپنے ساتھ اتنی دور نہیں لے جاسکتے۔ کیونکہ ہمیں بھی بدل کر یہاں سے نکلنا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ ہم اپنے کمانڈو چاقو ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ باقی سارے معاملات ٹارگٹ کے پاس پہنچ کر طے ہوں گے۔ میرا خیال ہے ہمیں آج ہی شام کو سری نگر سے ناگ پور کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے۔“

کمانڈو شیروان نے اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”میں تیار ہوں۔“

اس نے مجھ سے پوچھا کہ ہم کس قسم کا بھیں بدل کر نکلیں گے؟

میں نے کہا۔

”ہم یہاں سے عام مزدوروں کے لباس میں نکلیں گے۔ لیکن اپنی پتلونیں اور ٹھنڈے جیکٹ ساتھ رکھ لیں گے۔ یہ کپڑے ہم دوران سفر موقع دیکھ کر پہن لیں گے۔“ تیسرے پہر ہم نے چائے پی۔ اپنے مشن کی ایک ایک تفصیل کا بغور جائزہ لیا۔ اس کے بعد ایسا لباس یعنی پرانے کرتے اور پاجامے پہن لئے جو دلی تک محنت مزدوری کرنے والے لوگ عام طور پر پہنتے ہیں۔ اوپر ہم نے چادریں لے لیں۔ کمانڈو اورنگ زیب نے سر پر اونی ٹوپی اوڑھ لی۔ میں نے گلوبند لپیٹ لیا۔ چھ ماچس ہم کمانڈو اورنگ زیب نے اپنے پاس رکھ لئے۔ اور چھ میں نے اپنے پاس سنبھال کر رکھ لئے۔ ایک ایک کمانڈو چاقو بھی ہم نے اپنے لباس کے اندر چھپا لئے۔ کمانڈو شیروان نے ہمیں اتنی رقم دے دی جو ہم دونوں کے لئے ناگ پور اور وہاں سے ترچتا پلی تک کے سفر کے لئے کافی تھی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے ہم اپنے خفیہ ہائیڈ آؤٹ سے چل پڑے۔ کمانڈو شیروان ہمیں چھوڑنے اپنے علاقے کے آخری ٹیلے تک آیا۔ وہاں اس نے ہم دونوں کو گلے لگا کر ہمارے مشن کی کامیابی کی دعا کی اور ہم اللہ کا نام لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم دونوں تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔ مزدوروں کے بھیں میں تھے۔ ہماری نگاہیں دائیں

بائیں سامنے کی طرف بھی دیکھتی تھیں اور اپنے عقب سے بھی ہم ہوشیار رہتے تھے۔ میں نے مونچھیں بڑھا رکھی تھیں۔ یوں میری شکل تھوڑی بہت تبدیل ہو گئی تھی اور دور سے ایک نظر دیکھنے پر مجھے پہچانا نہیں جاسکتا تھا۔ میں یہاں اپنے خفیہ سفر کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ یوں سمجھ لیں کہ ہم جوں اور جالندھر کی خفیہ پولیس کی نگاہوں سے بچتے ہوئے دلی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم دلی کے سٹیشن سے باہر نہ نکلے۔ یہاں سے باہر نکلنا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ دلی پولیس میری تلاش میں تھی۔ ممکن تھا گوالیار کی ملٹری پولیس نے دلی والوں کو خبر نہ کی ہو کہ انہوں نے نام نہاد پاکستانی جاسوس کو طیارے سے گرا کر ہلاک کر دیا ہے۔ یہاں خفیہ پولیس کے پاس میری تصویر موجود تھی۔ دلی بہت بڑا ریلوے سٹیشن تھا۔ جہاں ہم مسافروں میں مزدور مسافر بنے بیٹھے رہے۔ دو تین گھنٹے کے انتظار کے بعد ہمیں ناگ پور جانے والی گاڑی ملی یہاں سے آگے ہمارا لہبا سفر شروع ہو گیا۔ یہ ٹرین اگرہ گوالیار اور جھانسی سے ہوتی ہوئی بھوپال جاتی تھی اور بھوپال سے آگے ناگ پور سے ہوتی ہوئی آگے ورنگل اور حیدر آباد دکن کی طرف نکل جاتی تھی۔ اس کا روٹ بڑا طویل تھا اور ایکسپریس ٹرین تھی۔ دوسرے دن جب گوالیار کا سٹیشن قریب آیا تو میں نے کمانڈو اورنگ زیب سے کہا۔

”یہاں ملٹری پولیس کے آدمی ضرور ہوں گے میں ان کی نظروں سے بچتا چاہتا ہوں۔“

جب گوالیار کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں ہاتھ روم میں کھس گیا اور اس وقت باہر نکلا جب ٹرین گوالیار سے چل پڑی تھی۔ جھانسی پہنچ کر ہم نے مزدوروں کا لباس اتار کر پتلونیں اور جیکٹیں پہن لیں۔ ہم نے باری باری ہاتھ روم میں جا کر اپنا لباس بدلا۔ ڈبے میں اتار ش تھا کہ ہماری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ رات کو بھوپال کا شہر آیا۔ پھر ساری رات گاڑی چلتی رہی تھی۔ یہاں سے ٹرین نے اپنا بمبئی والا روٹ بدل لیا تھا اور بھوپال بمبئی لائن کی بجائے ناگ پور ورنگل ٹریک پر سفر شروع کر دیا گیا۔

ناگ پور جس وقت ٹرین پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے کمانڈو اورنگ زیب کو

میجر شرت نے بڑی عقیدت سے پوچھا۔

”اپنی ماما جی کے سادھ پر میری طرف سے پھول چڑھانا تو نہیں بھول گئے تھے؟“
میں نے فوراً کہا۔

”بھیا یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ میں نے آپ کی طرف سے گیندے کے چار ہار ماما جی کی سادھ پر چڑھائے تھے۔“

”جھگوان تمہیں خوش رکھے۔ اچھا اب ہمارے بھائی ہماری لال کو کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ یہ بھی ہمیں تمہاری طرح پیارا ہے۔“
میں نے کہا۔

”بس بھیا! شیشن سے سیدھا آپ کے درشن کو آگیا تھا۔ اب کمرے میں جا کر بھوجن پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔“

میجر شرت نے گلاس اٹھاتے ہوئے کمائڈو اورنگ زیب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
”تمہارا بھائی اگر پیتا پلاتا ہے تو اسے میرے پاس ہی چھوڑ جاؤ۔“
میں نے ہنس کر کہا۔

”ارے نہیں بھیا جی! یہ تو پورا دیشنو ہے دیشنو۔ گوشت ماس کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا۔“

میجر شرت قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ہم اسے نمستے کہہ کر وہاں سے نکل آئے۔ باہر آکر کمائڈو اورنگ زیب کہنے لگا۔

”تم نے بڑی دانشمندی سے ملٹری انٹیلی جینس کے اس میجر کو اپنے قابو میں کیا ہوا ہے۔“

میں نے کہا۔

”دوست! خدا کار ساز ہے۔ لیکن ابھی میں اس سے ایک اور ملٹری سیکرٹ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اسی واسطے میں سیدھا ترچنا پلی جانے کی بجائے یہاں آگیا ہوں“

”وہ کیا سیکرٹ ہے؟“ کمائڈو اورنگ زیب نے پوچھا۔

گھٹلا کے بھائی میجر شرت دیوان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوا تھا۔ میں نے کمائڈو اورنگ زیب کا ہندو نام ہماری لال بھی رکھ دیا تھا۔ میں نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ میں میجر شرت دیوان سے اس کا تعارف اپنے تایا زاد بھائی کی حیثیت سے کراؤں گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ناگ پور سے سیدھا ترچنا پلی نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے کم از کم ایک روز ناگ پور میں رہ کر اپنے ٹارگٹ کے بارے میں کچھ ضروری خفیہ معلومات حاصل کرنی تھیں۔ جو میں سری نگر جاتے ہوئے حاصل نہ کر سکا تھا۔ میجر شرت دیوان سے میں نے جو کچھ کہنا سنا تھا وہ میں نے سب سوچ رکھا تھا۔

چنانچہ شیشن سے نکلنے ہی میں نے کمائڈو اورنگ زیب کو ساتھ لیا اور فوجی ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہیڈ کوارٹر کے گیٹ پر میں نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ سیکورٹی گارڈ نے کمائڈو اورنگ زیب کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ کچھ روز میرے پاس ٹھہرے گا۔ سیکورٹی گارڈ نے کمائڈو اورنگ زیب کو اندر جانے کی اجازت نہ دی۔ میں نے وہیں ملٹری ٹیلی فون سے میجر شرت کو فون کیا اور کہا کہ میں آگیا ہوں اور میرے ساتھ میرا تایا زاد بھائی ہماری لال بھی ہے جو درنگل کی ماچس فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ یہ چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ اب ڈیوٹی پر جا رہا ہے اور دو ایک روز میرے پاس رہے گا۔ میجر شرت دیوان نے فوراً سیکورٹی گارڈ سے کہا کہ انہیں آنے دو۔ میں وہاں سے اورنگ زیب کو ساتھ لے کر سیدھا میجر شرت کے ہوٹل میں آگیا۔ میجر شرت حسب معمول شراب و کباب میں مصروف تھا۔ میں نے اس کا کمائڈو اورنگ زیب سے مزید تعارف کرایا۔ کمائڈو اورنگ زیب نے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ میجر شرت بولا۔

”دھرم دیرا تم بڑی جلدی واپس آگئے ہو۔“

میں نے کہا۔

”بھیا! گورداسپور والی مذہبی جی تیر تھ یا ترا کو جوں گنی ہوئی تھیں۔ میں کس کے پاس ٹھہرتا۔ بس دو دن امرتسر میں رہا اور ہماری لال کے ساتھ واپس چل پڑا۔“

میں نے کہا۔

”میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ترجنا پٹی کی کھاڑی میں اسرائیل کے مرکنتائل جہاز جن چٹانوں کی اوٹ میں لنگر انداز ہیں ان چٹانوں پر سیکورٹی کے کیا انتظامات ہیں۔ اگر وہاں مشین گن پوسٹیں ہیں تو کہاں کہاں ہیں اور کتنی ہیں۔ یہ راز معلوم کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ ہمیں ان چٹانوں کے نیچے سے ہو کر جہازوں تک پہنچنا ہو گا۔“

اورنگ زیب نے پوچھا۔

”یہ راز تو شاید وہ تمہیں کبھی نہ بتائے۔“

میں نے کہا۔

”مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“

”تو پھر کس طریقے سے یہ انتہائی سیکرٹ راز معلوم کرو گے۔“

میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے چلتے چلتے کہا۔

”میجر شرٹ دیوان کے پاس ایک ٹاپ سیکرٹ فائل ہے جسے وہ ہمیشہ اپنے پاس الماری کے ایک خانے میں تالا لگا کر رکھتا ہے۔ میں اس فائل کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ راز اس فائل سے ہمیں ضرور معلوم ہو جائے گا۔“

”یہ کام تمہیں بڑی ہوشیاری سے کرنا پڑے گا۔“

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔

”فکر نہ کرو۔ میری کمائنڈو ٹریننگ میں انتہائی ٹاپ سیکرٹ فائلوں کے راز معلوم کرنا بھی شامل تھا۔ اس کام میں میں پورا تربیت یافتہ ہوں۔“

دوسرے روز مجھے میجر شرٹ دیوان نے فوجی کنٹین میں دوپہر کے بعد آکر بتایا کہ میں ایک دن کے لئے ماتاجی کے پاس چھندواڑے جا رہا ہوں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پھر اس نے مجھے کمرے کی چابی دے کر کہا۔

”تم میرے بھائی ہو۔ تمہارا بھائی آیا دوا ہے۔ اگر چاہو تو میرے کمرے میں جا کر آرام کر سکتے ہو۔“

میں نے جھوٹے دل سے کہا۔

”ماتاجی کی خبر لینے میں بھی جاؤں گا۔“

وہ بولا۔

”نہیں دھرم دیرا تم اپنی ڈیوٹی پر رہو میں تمہاری طرف سے پوچھ لوں گا۔“

جس ٹارگٹ تک پہنچنے کے لئے میں طرح طرح کی سکیمیں بنا رہا تھا۔ اس ٹارگٹ کی چابی مجھے میجر شرٹ دیوان نے خود ہی پکڑا دی تھی۔ اس روز رات کی گاڑی میں وہ ٹانگ پور سے چھندواڑے کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں نے کمائنڈو اورنگ زیب کو کہا۔

”میں آج رات میجر شرٹ کے کمرے میں جا کر سیکرٹ فائل والی الماری کھول کر

مطلوبہ راز معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔“

چنانچہ رات کے دوسرے پہر میں آفیسرز میس کے ہوسٹل کی طرف چلا۔ وہاں فوجی جگہ جگہ موجود تھے۔ سیکورٹی گارڈز بھی تھے مگر وہ مجھے شکل سے پہچانتے تھے۔ میں بڑے اعتماد کے ساتھ ان کے قریب سے گزرتا گیا۔ میجر شرٹ کے کمرے کا تالا کھولا۔ باقی روشن کی۔ دروازے کو بند کر کے کنڈی لگائی اور میجر کے بیڈ روم میں آکر ٹیبل لیپ جلا دیا۔ ٹاپ سیکرٹ فائل میجر شرٹ اپنے بیڈ روم والی الماری میں مقفل کر کے رکھتا تھا۔ میرے لئے ان الماریوں کے تالے کھولنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اپنے ساتھ لوہے کی آگے سے ہک کی طرح مڑی ہوئی ایک تار لے کر گیا تھا۔ الماری کا تالا بڑی آسانی سے کھل گیا۔ اس کے اندر ایک اور مقفل خانہ تھا۔ سیکرٹ فائل اس خانے میں تھی۔ اس تالے کو کھولنے میں خاصی مشکل پیش آئی۔ پھر بھی پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد میں تالا کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے خانہ کھولا۔ اس میں زرد رنگ کی صرف ایک ہی فائل پڑی تھی۔ جس کے اوپر انگریزی کے سرخ حروف میں ”ٹاپ سیکرٹ“ لکھا تھا۔ میں فائل کو لے کر میجر شرٹ کے پلنگ پر ٹیبل لیپ کی روشنی میں بیٹھ گیا۔ اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ اس میں انگریزی میں ٹاپ کئے ہوئے دس پندرہ صفحات تھے۔ ان میں زیادہ تر انڈین

ہائی کمانڈ کے ٹاپ رینک کے فوجی افسروں کے بارے میں خفیہ رپورٹیں تھیں۔ ایک صفحہ پر اوپر پراجیکٹ ”نیام پلے“ انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو گوہر مقصود میرے ہاتھ آگیا۔ یہ ترجتاپلی میں اسرائیل اور امریکی اسلحہ کی کھیپ کے بارے میں اہم نکات پر مشتمل تھا۔ میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تک بڑے غور سے پڑھا۔ اس خفیہ رپورٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ ان خطرناک اسلحہ والے دونوں بحری جہازوں کی سیکورٹی پر خاص توجہ دی گئی ہے اور جہاں یہ جہاز کھاڑی میں لنگر انداز ہیں اس کے پاس چٹانوں پر چار مشین گن پوشیں ہیں۔ جن میں مارٹر توپیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان جہازوں کو دشمن کمانڈوز کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے جہازوں کے ارد گرد فولادی تار کا جال بچھا دیا گیا ہے اور جہازوں کے اوپر سمندر کے اندر جا کر پھٹنے والے گولوں کی توپیں بھی نصب ہیں جو ذرا سے شک پڑنے پر ارد گرد کے سمندر میں گولہ باری شروع کر سکتی ہیں۔ اس رپورٹ میں دونوں جہازوں کے کوڈ نام بھی لکھے ہوئے تھے۔ میں نے یہ ساری ضروری معلومات ایک الگ کانڈ پر اتار لیں فائل بند کر کے الماری کے خانے میں رکھ کر خانے کا تالا دوبارہ بند کیا۔ پھر الماری کو تالا لگا رہا تھا کہ دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی۔

یقین کریں میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ لگتا تھا جیسے فوج نے اچانک حملہ کر دیا

ہے۔

اس کے بعد کے سنسنی خیز واقعات کے لئے بھارت کے فرعون حصہ ششم ”فوجی کیمپ سے فرار“ میں ملاحظہ فرمائیں